جلد (۶) عدد ۵
جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۵ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کیے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شد و مد کیساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی۔ جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہ صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت بلا جلد (للعہ) سکہ انگریزی (لعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت صہ سکہ انگریزی صہ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

(یہ کتاب مکتبہ علمیہ حیدرآباد سے بھی مل سکتی ہے۔)

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۵۴ھ جلد ۶ عدد ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نئے دور کے مجددین و مجتہدین کو سب سے زیادہ جس چیز کا دعویٰ ہے وہ "عقلیت" ہے، مگر افسوس کہ ان کی باتوں میں سب سے زیادہ جس چیز کا فقدان پایا جاتا ہے وہ یہی ہے۔ وہ خود اپنی ایک بات کی تردید دوسری بات سے کر جاتے ہیں، اور یہ تک محسوس نہیں کرتے کہ ان کے کلام میں کھلا ہوا تناقض ہے۔ ماہ گذشتہ کے اشارات میں جن مجتہد صاحب کے "وعظ قرآنی" کا ذکر کیا گیا تھا، ان کے اجتہاد کا بھی یہی حال ہے۔ ایک طرف وہ اپنی کتاب "مطالعہ حدیث" میں خود تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو پابندی وقت کے ساتھ فرض کیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ (۴: ۱۵) دوسری طرف اپنے وعظ میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ نماز کے لیے منجملہ اور شرائط کے ایک "ضروری شرط" مشاغل دنیاوی سے یکسوئی بھی ہے۔ یہ دونوں باتیں انہوں نے اس اطمینان کے ساتھ فرمائی ہیں کہ ان میں باہم کوئی اختلاف نہیں، حالانکہ اگر وہ اپنی عقل پر زور دیتے تو ان کو خود معلوم ہو جاتا کہ پابندی وقت کے ساتھ یکسوئی کی شرط لگانا کسی عاقل کا کام نہیں ہو سکتا۔ عملی زندگی میں ہمیشہ ان دونوں شرطوں کا ساتھ ساتھ نبھنا تقریباً محال ہے، اور جب یہ دونوں شرطیں ساتھ ساتھ لگائی جائیں گی تو ایک شرط ضرور ساقط ہو جائے گی۔

نماز میں یکسوئی کو ضروری شرط قرار دینے سے ان کا صریح مدعا یہ ہے کہ اگر یکسوئی نہ ہو تو نماز ہی

نہ ہوگی۔ اسی بنا پر انہوں نے ظہر اور مغرب کے اوقات کو ساقط کیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ان اوقات میں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، اس لیے نماز بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر یکسوئی ضروری شرط ہو تو نماز کے لیے سرے سے کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ صبح کا وقت یکسوئی کا ہوتا ہے۔ مگر کیا اس مزدور کو بھی صبح کے وقت یکسوئی حاصل ہوتی ہے جسے طلوع آفتاب سے پہلے اپنے کارخانہ میں پہنچ جانا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ عصر کا وقت یکسوئی کا ہے۔ ممکن ہے کہ ڈپٹی کلکٹروں کے لیے ہو جو چار بجے دفتر سے اٹھ کر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ مگر کیا اس دوکاندار کے لیے بھی یہ وقت یکسوئی کا ہوتا ہے جس کے پاس تیسرے پہر کو خریداروں کا ہجوم ہوتا ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ عشا کا وقت یکسوئی کا ہے ممکن ہے کہ آپ کے لیے ایسا ہو۔ مگر ریلوے کے اس ملازم سے پوچھیے جو اپنی نائٹ ڈیوٹی پر ہوتا ہے کیا وہ بھی اقرار کرے گا کہ عشا کے وقت اسے یکسوئی میسر آتی ہے؟ نماز تنہا ایک شخص یا اشخاص کے ایک مخصوص گروہ کے لیے تو نہیں ہے۔ نہ اس کے اوقات مقرر کرنے میں محض "صاحب لوگوں" کے نظام الاوقات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ تو تمام لوگوں کے لیے ہے، اور تمام لوگوں کے لیے اوقات میں سے کوئی وقت بھی ایسا معین نہیں کیا جا سکتا جس میں سب کو یکسوئی حاصل ہوتی ہو۔

تمام لوگوں کو بھی چھوڑیے۔ ایک شخص ہی کو لے لیجیے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ روزانہ دو یا تین مرتبہ بھی ایک ہی مقرر وقت پر اسے یکسوئی حاصل ہوتی ہے؟ یکسوئی گھڑی کی سوئی کی پابند تو نہیں کہ جہاں سوئی نے چکر کاٹ کر ایک خاص ساعت کے نشان پر پہنچی اور یکسوئی حاصل ہوئی۔ ممکن ہے کہ صبح کا وقت کسی شخص کے لیے عموماً یکسوئی کا ہوتا ہو۔ مگر لازم نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو۔ لہذا آپ کے فتوی کے مطابق جس روز صبح کو اسے یکسوئی نصیب نہ ہو اس روز وہ صبح کی نماز چھوڑ دے۔ اسی طرح عصر اور عشا کے اوقات کی تعیین بھی اگر یکسوئی کے ساتھ مشروط ہو تو شائد کوئی شخص بھی ہمیشہ پابندی کے ساتھ ان اوقات میں نماز نہ پڑھ سکے گا۔ لہذا فتوی اس صورت میں مرتب کرنا پڑے گا کہ ان اوقات میں سے اگر کسی وقت یکسوئی حاصل ہو تو نماز ادا کر لو ورنہ

دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ یہ لازمی نتیجہ ہے نماز کے لیے یکسوئی کو ضروری شرط قرار دینے کا۔ اور اس شرط کو پورا کرنے کا۔ لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری شرط، یعنی پابندی وقت کی شرط ساقط ہو جائے۔

سوال یہ ہے کہ مجتہد صاحب نے یہ شرط قرآن کی کس آیت سے نکالی ہے؟ قرآن میں کہاں ارشاد ہوا ہے کہ نماز کے لیے یکسوئی اور حضور قلب ضروری ہے؟

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ سے استدلال صحیح نہیں۔ اس لیے کہ خشوع کے معنی یکسوئی کے نہیں، ضراعت کے ہیں۔ یعنے خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و حقیر و ضعیف و عاجز سمجھنا۔ اور جوارح سے اس کا اظہار بھی کرنا۔ یہ بات یکسوئی کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر انسان دل میں یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ وہ خدا کے سامنے عاجز اور ذلیل ہے، اور اسی اعتقاد کے ساتھ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو، رکوع میں جھکے اور زمین پر پیشانی رکھ کر سجدہ کرے، تو بہر حال وہ خاشعین میں داخل ہو گیا، خواہ اسے مشاغل دنیوی سے یکسوئی حاصل ہو یا نہ ہو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰی سے بھی استدلال غلط ہے اس لیے کہ اس حکم سے متصل ہی اس کی غایت بھی بتا دی گئی ہے یعنی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ "حق گو" صاحب کا استدلال یہ ہے کہ جب شراب حرام نہ ہوئی تھی اس وقت نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور اس ممانعت کی اصلی وجہ یہی تھی کہ نشہ کی حالت میں یکسوئی نہیں ہوتی۔ مگر یہ سراسر غلط ہے۔ نشے کی تو سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں یکسوئی (Concentration) خوب ہوتی ہے قرآن کا بھیجنے والا ایسی خلاف واقعہ بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ اس نے ممانعت کے ساتھ خود ہی اس کی یہ وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ نشہ کی حالت میں تم کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا زبان سے کچھ کا کچھ نکل جاتا ہے، اور تم کو خود خبر نہیں ہوتی کہ تمہاری زبان سے کیا نکل رہا ہے۔ لہٰذا جب تم اس حال میں ہو تو نماز کے قریب بھی نہ پھٹکو۔

اس میں شک نہیں کہ یکسوئی کے ساتھ نماز پڑھنا افضل ہے جس قدر زیادہ حضورِ قلب، انابت اور توجہ الی اللہ کے ساتھ نماز پڑھی جائے گی اسی قدر زیادہ کامل اور بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوگی۔ مگر کسی چیز کا درجۂ کمال ہونا اور چیز ہے اور شرطِ لازم ہونا اور چیز۔ نماز کے لیے جو ارکان مقرر کیے گئے ہیں، اگر ان کو ایمان کے ساتھ اوقاتِ مقررہ میں ادا کر دیا جائے، تو بہرحال نماز ہو جائیگی، خواہ کامل ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ ہم کو صرف اطاعتِ امر کی تکلیف دی گئی ہے نہ کہ درجۂ کمال کو پہنچنے کی۔ اگر ہم ادائے فرض پر اکتفا نہ کریں، اور خود اپنی دلی رغبت سے کمال کو پہنچنے کی کوشش کریں تو یہ احسان کا درجہ ہے، جس کے لیے مزید ثواب اور انعام ہے۔ لیکن احسان کو ہم پر فرض نہیں کیا گیا کیونکہ اس کی فرضیت اسلام کو صرف کاملین کے لیے مخصوص کر دیتی اور عام افرادِ انسانی جن میں کمال کو پہنچنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس سے محروم رہ جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں نماز کی فرضیت پر تو بہت زور دیا گیا ہے، مگر اس کے ساتھ حضورِ قلب اور مشاغلِ دنیاوی سے یکسوئی کی شرط نہیں لگائی گئی۔

حق گو صاحب نے اسلام کی نماز کو بھی راہبوں کی عبادت اور جوگیوں کی ریاضت سمجھ لیا ہے، اسی لیے وہ یکسوئی کو نماز کے لیے ضروری شرط قرار دے رہے ہیں جو قریب قریب دھیان اور مراقبہ کی ہم معنی ہے۔ حالانکہ دراصل نماز تارک الدنیا لوگوں کے لیے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کو دنیا کے دھندوں میں پھنسنے اور فطرت کے تمام داعیات پورے کرنے اور دنیوی زندگی کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر جناب "حق گو" ذرا غور و فکر سے کام لیتے اور اسلام کی اسپرٹ اور اس کے نظام کی عملی بنیادوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ مذہب دین کو دنیا سے [illegible] بلکہ دنیاداری کی اس طرح اصلاح کرنا چاہتا ہے کہ وہی عین دینداری بن جائے۔ اس نے نجات کا راستہ دنیا سے باہر نہیں بتایا ہے بلکہ

دنیوی کاروبار کے عین مجمع دار میں سے ایک سیدھا راستہ نکالتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہی راستہ تم کو جنت النعیم کی طرف لے جائے گا۔ اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ تم دنیا کے تمام کاروبار ایک پورے اور پکے دنیادار کی طرح انجام دو، مگر یہ حقیقت پیش نظر رکھو کہ اس کاروبار کا حاکم خدا ہے۔ اسی کے حکم کی اطاعت تم پر واجب ہے۔ ظاہر اور باطن میں جو کچھ تم کرتے ہو سب کو وہ جانتا ہے، اور ایک دن تم سے تمہاری زندگی کے تمام اعمال کا حساب لینے والا ہے۔ اگر تم نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی، اپنے معاملات میں اس کی حدود کو ملحوظ رکھا، اور اس کے مقرر کیے ہوئے قوانین پر عمل کیا تو اس کی خوشنودی سے سرفراز کیے جاؤ گے ورنہ اس کے غضب میں گرفتار ہوگے یہی سبق ہے جس کو بار بار یاد دلانے کے لیے نماز فرض کی گئی ہے، اور اس کے لیے ایسے اوقات مقرر کیے گئے ہیں جن میں اس تذکیر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

قرآن کا پہلا ورق کھولتے ہی آپ کو یہ آیت ملتی ہے:-

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۲:۱)

یہی وہ کتاب ہے جس میں شک ہے ہی نہیں۔ یہ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو ہم نے تیری طرف نازل کی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے نازل کی گئی ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت پر غور کیجیے۔ قرآن کی ہدایت و رہنمائی سے مراد بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ انسان کو دنیا میں فکر و عمل کی صحیح راہ بتاتا ہے، علم کی روشنی دیتا ہے، زاویہ نظر کو سیدھا کر دیتا ہے، اور عمل کا وہ راستہ دکھاتا ہے جو انسان کو اس دنیوی زندگی کے پیچ در پیچ راستوں میں سے سلامتی کے ساتھ گذار کر نجات کی طرف لے جانے والا ہے

مگر یہ راستہ صرف اسی شخص کے لیے کھل سکتا ہے جو غیب پر ایمان لائے، خدا کو مانے، اس کی کتاب کو مانے، یوم آخر کے پیش آنے پر یقین رکھے، نماز پڑھے، اور محض خدا کی خوشنودی کے لیے اپنا وہ مال خرچ کرے جس کو وہ عزیز رکھتا ہے۔ جو شخص ان شرائط کو پورا کرے گا وہی قرآن کی رہنمائی پر چل سکے گا اور وہی کامیاب ہوگا۔ اُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

اس سے نماز کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔

نماز ایمان بالغیب کو راسخ کر دیتی ہے۔ وہ ایک ان دیکھے خدا پر ایمان ہی ہے جو ایک شخص کو اپنا آرام، اپنا کام کاج، اپنے فوائد و منافع، سب کچھ چھوڑ کر دن میں کئی دفعہ نماز پڑھنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کو بار بار کھینچ کر مصلے کی طرف لیجاتا ہے۔ ایمان کی تحریک سے نفس کے اس طرح بار بار متاثر ہونے اور اسی کی متابعت میں جوارح کے حرکت کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ نفس پر ایمان کا اقتدار مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ مقتضیات ایمان کے مطابق سیرت کی تشکیل کر سکے۔ درحقیقت نماز ہی ایک ایسا فعل ہے جس میں انسان قولاً و عملاً اسلام کے پورے کریڈ کا اعادہ کرتا ہے۔ تکبیر سے لیکر سلام تک جو کچھ ہے وہ اسی کریڈ کی تکرار ہے۔ خدا پر ایمان، اس کے رسول پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان، اس کے یوم الحساب پر ایمان، اس کو حاکم حقیقی سمجھنا، اس کی خوشنودی کا طلبگار رہنا، اس کے حساب سے ڈرنا، اس کو علیم و خبیر جاننا، یہ سب کچھ نماز میں آجاتا ہے۔ شعور جلی میں نہ سہی، شعور خفی میں تو ضرور یہ سب امور ہر اس شخص کے دل میں راسخ ہوتے ہیں جو نماز کی پابندی کرتا ہے، کیونکہ اگر ذہن ان سے خالی ہو تو انسان نماز کی پابندی کر ہی نہیں سکتا۔

جب یہ عمل اس تکرار و اعادہ سے انسان کے ذہن میں اسلام کے کریڈ کو مستحکم کر دیتا ہے، اور اسی کی متابعت میں جسم کو امتثال امر کا خوگر بناتا ہے، تو اس سے لازمی طور پر انسان کو عملاً اطاعت احکام الٰہی کی

شق ہوتی چلی جاتی ہے، اس میں فرض شناسی کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے اور اس میں یہ قابلیت بڑھتی جاتی ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات میں اسلام کے ڈسپلن کی پابندی کرسکے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص روزانہ صبح کی نیند کا لطف چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھے گا محض اس لیے کہ خدا نے اس کو نماز کا حکم دیا ہے، جو شخص ہر روز ظہر اور عصر کے اوقات میں دو مرتبہ اپنے دنیوی مشاغل سے ہاتھ اٹھا کر مصلے کی طرف دوڑے گا، محض اس لیے کہ اس کا ان دیکھا خدا اسے بلا رہا ہے، جو شخص ہمیشہ اپنی شام کی تفریحوں اور دلچسپیوں کو چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لیے کھڑا ہوگا محض اس لیے کہ خدا نے یہ فرض اس پر عائد کیا ہے، جو شخص ہر شب میں معصیت کے مواقع کی طرف جانے کے بجائے اپنے خدا کی طرف جائے گا محض اس لیے کہ خدا کے حکم کی اطاعت کو وہ اپنا فرض جانتا ہے اس سے یہ امید بھی کی جاسکتی ہے کہ نماز سے فارغ ہوکر جب وہ عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھے گا تو اسی ان دیکھے علیم و خبیر معبود کا خوف اس کو خفیہ اور علانیہ گناہوں سے روکیگا، اس کے ہاتھ کو ظلم و تعدی کی طرف بڑھنے سے باز رکھیگا، اسے خدا کے احکام کی اطاعت، اس کے قوانین کی پابندی اور اس کے قائم کردہ حدود کا لحاظ کرنے پر ابھارے گا اور اس میں اتنی قوت پیدا کردے گا کہ نہ آسائش کا خیال اسے ادائے فرض سے روک سکے، نہ دنیوی فوائد کی طمع اس کو حد سے تجاوز کرنے پر آمادہ کرسکے، اور نہ دنیا کی دلچسپیاں اُس کو خدا سے غافل کرسکیں۔ بالفرض اگر نماز سے اس کی اخلاقی تربیت اتنی مکمل نہ ہوسکی تو کم از کم اس کی فرض شناسی اور اطاعت کیشی اور خشیت ہی اس شخص سے تو زیادہ ہی ہوگی جو خدا کی پکار سنتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ جو خدا کے عاید کیے ہوئے فرض کو اپنی آسایش یا اپنے کاروبار یا اپنی تفریحات کی خاطر بے تکلف چھوڑ دیتا ہے۔

نماز اگر حضور قلب اور کامل توجہ کے ساتھ ہو تو اس کے روحانی فوائد کا پوچھنا ہی کیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس مصلحت عظمیٰ کے لیے اس چیز کو فرض کیا ہے، وہ تو یکسوئی کے بغیر بھی محض اوقات مقررہ پر نماز کے ارکان ادا کرلینے سے حاصل ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یکسوئی اور حضور قلب پر زور دینے کے بجائے

اوقات پابندی پر زور دیا گیا ہے، اور رات کے وقت سکون و اطمینان کی حالت میں جو نماز ادا کی جاتی ہے اس کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی اس نماز کو دی گئی ہے جو دنیوی کاروبار کے انہماک سے اٹھ کر ادا کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے کہ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عموماً عصر کا وقت لیا گیا ہے۔ اور احادیث بھی زیادہ تر اسی کی تائید میں ہیں۔ تمام نمازوں سے الگ اس نماز کی پابندی پر خاص طور سے زور دینے کی وجہ یہی ہے کہ اس نماز کا وقت ایسا ہے جس میں عام طور پر لوگ زیادہ مشغول ہوتے ہیں۔ یہ تخصیص صاف بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہاری توجہ اتنی پسندیدہ نہیں جتنی یہ ادا پسندیدہ ہے کہ جب اس کی پکار تمہارے کان میں پہنچے تو تم اپنے مشاغل، اپنی دلچسپیاں، اپنے فوائد و منافع سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف لپکو اور اس کے حکم کی بجا آوری کو ہر اس چیز پر ترجیح دو جو تمہیں عزیز ہو۔ اسی لیے نماز جمعہ کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (۶۲ : ۲) جب جمعہ کی نماز کے لیے پکارا جائے تو یادِ خدا کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اپنے کاروبار میں خدا کا فضل تلاش کرو۔

آپ کہتے ہیں کہ دنیوی مشاغل کے اوقات میں نماز بے دلی سے ہوتی ہے۔ دل اپنے کاروبار یا کھیل کود میں پڑا رہتا ہے۔ خدا کی طرف توجہ نہیں ہوتی، بغیر سمجھے بوجھے محض رٹے ہوئے الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اور بلا ارادہ چند جسمانی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہی نماز بڑی قیمت رکھتی ہے جو شخص اپنے کاروبار یا اپنی تفریح سے اتنی دلچسپی رکھتا ہے کہ اس سے ہٹنے کے بعد بھی اس کا دل وہیں پڑا رہتا ہے وہ تو اپنے خدا کے لیے بڑی قربانی کرتا ہے کہ اپنی ایسی دلچسپی میں بھی اس کا حکم یاد کرتا ہے اس کے فرمان کی

بجا آوری کے لیے اپنا مرغوب کام چھوڑ کر اٹھتا ہے۔ اپنی توجہ کو اس پسند خاطر چیز سے خدا کی طرف پھیر دیتا ہے اور با دل ناخواستہ ہی سہی مگر دل پر جبر کر کے خدا کا ذکر تو کرتا ہے۔ کیا آپ کے نزدیک اس ایثار، اس اطاعت امر، اور اس فرض شناسی کی کوئی قیمت ہی نہیں؟ کیا یہ شخص اپنے خدا کی آزمائش میں پورا نہیں اترا؟ کیا اس نے ضبط نفس، اور خدا ترسی کا ثبوت نہیں دیا؟ کیا اس نے اپنے عمل سے ثابت نہیں کر دیا کہ اس میں فرض کی خاطر اپنے مرغوبات کو قربان کر دینے کی قوت موجود ہے؟ اگر وہ ان ایمانی اور اخلاقی صفات کا مالک نہ تھا تو کیا چیز تھی جو اس کو اپنے فائدہ بخش یا دل پسند کام سے نماز کی طرف کھینچ لائی؟ یہاں بجز اطاعتِ امر اور خوف خدا کے اور کیا منفعت یا دلچسپی ہے؟

افسوس ہے کہ اسلام کے ایسے ایسے اہم مسائل اور احکام پر آج وہ لوگ اپنے اجتہاد کی قینچیاں چلا رہے ہیں جن میں نہ اتنی علمی و عقلی استعداد ہے کہ اسرار دین تو درکنار اس کے مبادی ہی کو سمجھ سکیں، نہ اتنا خوف خدا ہے کہ مہمات دینی پر اپنے سطحی اور جاہلانہ اجتہادات کی اشاعت سے ہزاروں مسلمانوں کے اعتقاد و عمل کو خراب کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے ڈریں، نہ اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ علم و فہم کا جھوٹا پندار چھوڑ کر جو کچھ نہ جانتے ہوں اس کو جاننے والوں سے پوچھیں اور جو کچھ نہ سمجھتے ہوں اس کو سمجھنے والوں سے سمجھیں۔ مسلمانوں کی کیسی شامت ہے کہ آج اس حیثیت کے لوگ ان کی مذہبی رہنمائی کرنے کے لیے اٹھنے کی جرأت کرتے ہیں۔

مقالات

عبادت

(۲)

پچھلی صحبت میں سلسلۂ کلام یہاں تک پہنچا تھا کہ انسان اپنے معبود کی تلاش میں جب تک خدائے واحد تک نہ پہنچا بے چین رہا، غیر مطمئن رہا، اس کے دل میں تلاش کی بے کلی اور جستجو کی کھٹک برابر چٹکیاں لیتی رہی۔ مگر جب خدائے واحد کو اس نے پا لیا تو اس کا دل مطمئن ہو گیا۔ پھر کبھی اس نے تلاش معبود کی بے چینی محسوس نہ کی۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ خدا کے سوا کسی غیر پر تلاش معبود کا سفر ختم نہیں ہوا اور خدا تک پہنچکر یہ سفر ایسا ختم ہوا کہ پھر کسی اور کی جستجو دل میں پیدا ہی نہ ہوئی؟ غور کرنے سے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو جو فطری جذبہ پرستش پر مجبور کرتا ہے، اس کا اصل مقصد خدائے واحد ہی کی پرستش ہے جب تک وہ اپنے اس مقصود حقیقی کو نہیں پہنچ جاتا مطمئن نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ عقل و فکر کی نارسائی یا آبا و اجداد کی اندھی تقلید انسان کو یہ بے اطمینانی محسوس نہ ہونے دے۔

جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، انسان کے اندر پرستش کا فطری جذبہ پیدا ہی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے گرد وپیش کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی بندگی میں مشغول ہے۔ ایسی حالت میں جب ایک ظلوم و جہول انسان خدا سے ناواقف ہو کر غیر خدا کی پرستش کے لیے جھکتا ہے تو اس کے گرد وپیش کائنات کا کوئی عنصر حتی کہ خود اس کے جسم کا کوئی جز اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ جن پاؤں سے اپنے خود ساختہ معبود کی طرف بڑھتا ہے

وہ خدا کی عبادت میں چلتے ہیں۔ وہ جن ہاتھوں سے اس کے آگے نذر پیش کرتا ہے وہ خدا کی بندگی میں حرکت کرتے ہیں۔ وہ جس پیشانی سے اس کو سجدہ کرتا ہے وہ خدا کے سجدے میں جھکی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ جس زبان سے اُس کی بڑائی بیان کرتا ہے وہ خدا کی تقدیس وتمجید میں مشغول ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کی یہ ساری پرستش، یہ تمام نمایش وگزارش، ایک جھوٹ، ایک افترا، ایک بہتان ایک صریح جہل ہوتی ہے جس کے بطلان پر کائنات کا ہر ذرہ گواہی دیتا ہے، اور خود انسان کی فطرت اپنی لطیف وغیر محسوس آواز میں بار بار اسے تنبیہ کرتی ہے کہ یہ تو کس دھوکہ میں پڑ گیا ہے؟ کیا تجھے بندے کی بندگی، پرستار کی پرستش، فرمانبردار کی فرمانبرداری کرتے شرم نہیں آتی؟ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ۔

پرستش دراصل بندگی کی فرع ہے اور اپنی عین فطرت کے اقتضاء سے اپنی اصل کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ جب انسان اپنے جہل وبے خبری کی بنا پر فرع کو اصل سے جدا کرتا ہے، بندگی ایک کی کرتا ہے اور پرستش دوسرے کی تو یہ تفریق سراسر فطرت کے خلاف واقع ہوتی ہے، اور ایک نہایت خفی وغیر محسوس تحت الشعوری بے اطمینانی پیدا ہوجاتی ہے بخلاف اس کے جب نادانی کا پردہ درمیان سے اٹھ جاتا ہے اور انسان کو اس حقیقت کا علم حاصل ہوجاتا ہے کہ معبود وہی ہے جو مالک اور خالق اور پروردگار ہے، تو بندگی اور پرستش دونوں یکجا ہوجاتی ہیں۔ فرع اصل سے مل جاتی ہے، بیٹی اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ جاتی ہے اور اس وصال سے وہ لطف، وہ مزہ، وہ اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے جو ہجر وفراق کی حالت میں مفقود تھا۔

بندگی اور پرستش کی یہی مواصلت ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوقات پر شرف حاصل ہوتا ہے، اور وہ اس مرتبہ پر پہنچتا ہے جسے خدا نے اپنی خلافت ونیابت قرار دیا ہے۔ پچھلی تقریر پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے عرض کرچکا ہوں کہ خدا کی بندگی تو انسان آپ سے آپ بلا عمد و اختیار، بغیر جانے بوجھے کر ہی رہا ہے، اور ٹھیک اسی طرح کر رہا ہے، جس طرح لا یعقل حیوان، بے شعور درخت، بے جان پتھر کر رہے ہیں۔ اس حیثیت سے اس میں اور مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔ اور اس بندگی کا جو انعام ہے، یعنی فیضان وجود اور عطائے رزق، اس میں بھی

وہ فی الحقیقت دوسری مخلوقات سے ممتاز نہیں ہے۔ فرق و امتیاز اور برتری و شرف جو کچھ ہے اس امر میں ہے کہ دوسری موجودات کے برخلاف جو عقل و شعور اور جو قوت علمیہ اس کو دی گئی ہے اس سے کام لے کر وہ اس کو پہچانے جس کا وہ بندہ ہے، اور بالاختیار اسی کی پرستش کرے جس کی وہ بلا اختیار بندگی کر رہا ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا اور اپنی عقل اور قوت علمیہ سے اپنے مالک کی معرفت حاصل نہ کی، اور اپنے اختیار سے اس کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش شروع کر دی تو شرف کیسا، وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ - (۷: ۲۲)۔

بجائے خود عقل اور قوت علمیہ میں تو کوئی شرف اور برتری نہیں۔ یہ محض حصول شرف کے لیے ایک آلہ تھا۔ اس آلہ نے انسان کو یہ استعداد بہم پہنچا دی کہ اس سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر بندگی اضطراری کے حیوانی مقام سے ترقی کر کے عبادت اختیاری کے انسانی مقام پر پہنچ جائے۔ مگر جب اس نے اس آلہ سے غلط کام لیا اور اس کو چھوڑ کر جس کا وہ بندہ ہے، ان کی عبادت اختیار کی جن کا فی الحقیقت وہ بندہ نہیں ہے تو وہ حیوانی مقام سے بھی نیچے اتر گیا۔ حیوان گمراہ تو نہ تھا، یہ گمراہ ہوا۔ حیوان منکر تو نہ تھا، یہ منکر ہوا۔ حیوان کافر و مشرک تو نہ تھا، یہ کافر و مشرک ہو گیا۔ حیوان جس مقام پر پیدا کیا گیا تھا اسی مقام پر قائم رہا، اور حیوان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی اسی مقام پر ہے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو جو ترقی کرنی چاہیے تھی وہ اس نے نہ کی، بلکہ الٹا تنزل کی طرف چلا گیا۔ ترقی کے لیے اس کو جو آلہ دیا گیا تھا اس کو اپنے انسانی ترقی کے لیے استعمال نہ کیا، بلکہ حیوانیت میں ترقی کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے دوربین بنائی کہ حیوان جتنی دور کی چیز دیکھ سکتا ہے اس سے زیادہ دور کی چیز یہ دیکھ سکے۔ اس نے ریڈیو ایجاد کیا کہ حیوان جتنی دور کی چیز سن سکتا ہے اس سے زیادہ دور کی چیز یہ سن سکے۔ اس نے ریل اور موٹر بنائی کہ حیوان جس قدر قطع مسافت کر سکتا ہے اس سے زیادہ یہ کر سکے۔ اس نے ہوائی جہاز بنائے کہ اڑنے میں پرندوں سے بازی لے جائے۔

اس نے بڑے بڑے جہاز بنائے کہ تیرنے میں مچھلیوں کو مات کر دے۔ اس نے آلات حرب بنائے کہ لڑنے میں درندوں سے سبقت لے جائے۔ اس نے عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے کہ جانوروں سے زیادہ پرلطف زندگی بسر کرے مگر کیا ان ترقیات کے باوجود یہ مقام حیوانی سے کچھ بھی بلند ہوا؟ عقل و علم کے ذریعہ سے عالم مادی میں جتنے تصرفات اس نے کیے وہ سب کے سب انہیں قوانین فطرت کے تو ماتحت ہیں، جن کے تحت عقل و علم کے بغیر حیوانات ایک محدود پیمانے پر ایسے ہی تصرفات کرتے ہیں۔ پس یہ تو وہی اضطراری بندگی کا مقام ہوا جس میں حیوان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حیوان نے کمتر درجہ کی بندگی کی۔ کمتر درجہ کا انعام پایا۔ اس نے عقل و علم کی قوت سے اعلیٰ درجہ کی بندگی کی۔ اعلیٰ درجہ کے انعام کا مستحق ہوا۔ حیوان کو گھانس ملتی تھی۔ اس کو توس اور مکھن ملا۔ حیوان کو صوف اور اون ملتا تھا۔ اس کو نفیس کپڑے ملے۔ حیوان کو گھونسلے میں جگہ دی جاتی تھی۔ اس کو بنگلوں اور کوٹھیوں میں ٹھیرایا گیا۔ حیوان کو پیدل دوڑنا پڑتا تھا۔ اس کو گاڑی دیدی گئی۔ یہ اس کی بندگی اس کی اضطراری عبادت کا کافی انعام ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ترقی کا جو آلہ اس کو دیا گیا تھا اس سے اس نے ترقی کیا کی؟ ترقی کے معنے تو یہ تھے کہ حیوان ہونے کی حیثیت سے یہ جس کی بغیر جانے بوجھے بندگی کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے جان بوجھ کر بھی اسی کی بندگی و عبادت کرتا۔ حیوان ہونے کی حیثیت سے جس کو بے اختیارانہ سجدہ کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اختیاری سجدہ بھی اسی کو کرتا۔ حیوان ہونے کی حیثیت سے جس کے حکم تکوینی کی اطاعت کر رہا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اسی کے حکم شرعی کی اطاعت بھی کرتا۔ اگر یہ ترقی اس نے کی تو بے شک یہ حیوانات اور تمام موجودات پر شرف لے گیا اس نے بالفعل وہ خلافت حاصل کر لی جس کی قوت و استعداد اس کو دی گئی تھی۔ اس نے تمام موجودات سے بڑھ کر اپنے خالق کی بندگی و عبادت کی۔ اس لیے تمام موجودات عالم سے زیادہ اجر کا مستحق ہو گیا لیکن اگر یہ ترقی اس نے نہ کی، اور آلہ ترقی کے غلط استعمال سے اُلٹ تنزل کی پستیوں میں اتر گیا تو بلاشائبۂ شک اور یہ تمام اسافل سے اسفل اور تمام اراذل سے ارذل بن گیا۔ اور اس نے خود اپنی حماقت سے اپنے آپ کو

عذاب کا مستحق بنالیا۔ یہی حقیقت ہے جس کو سورۂ تین میں بیان کیا گیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر اس کو تمام ادنیٰ درجہ والوں سے بھی ادنیٰ درجہ میں پھیر دیا بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے کہ ان کے لیے بے نہایت اجر ہے۔

یہ اجمال ان تفصیلات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ "احسن تقویم" سے مراد ترقی کی وہ قوت واستعداد ہے جو زمین کی تمام مخلوقات سے بڑھ کر انسان کو دی گئی ہے۔ مگر محض احسن تقویم پر ہونا بالفعل ترقی نہیں ہے۔ ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ انسان اس قوت واستعداد سے کام لے کر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے جس کے انتہائی مرتبہ کا نام "ایمان" ہے، اور اس کے حکم شرعی کی اطاعت کرے جس کو "عمل صالح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس نے یہ نہ کیا وہ ادنیٰ درجہ کی مخلوقات سے بھی فروتر درجہ میں گر گیا۔ اور جس نے یہ ترقی کرلی وہ اجر غیر ممنون کا مستحق ہو گیا یعنی ایسا اجر جو کبھی بند ہونے والا نہیں ہے۔ بندگی اضطراری کے صلہ میں جو اجر ملتا ہے وہ منقطع ہو جاتا ہے ایک اجل مقرر تک زندگی عطا کی جاتی ہے۔ ایک حد خاص تک رزق دیا جاتا ہے۔ مگر عبادت اختیاری کے صلہ میں وہ عیش نصیب ہوتا ہے جو زوال سے پاک ہے، اور وہ رزق میسر آتا ہے جس کے بند ہونے کا کوئی خوف نہیں۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں عبادت کا صحیح اور مکمل مفہوم واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ عبادت کے اجزاء معنوی دو ہیں جن کی ترکیب سے عبادت کا مفہوم مکمل ہوتا ہے۔ ایک بندگی یعنی قانون فطرت کی ٹھیک ٹھیک پیروی اور اس سے منحرف نہ ہونا۔ دوسرے پرستش جو اپنی تکمیل کے لیے دو چیزوں کی محتاج ہے۔

ایک اپنے حقیقی معبود یعنے خدائے واحد کی ایسی معرفت جو بالکل خالص ہو، جس میں شرک کا شائبہ تک

نہ ہو جس میں کفر و انکار اور شک و ریب کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہو، جس میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو، کسی کے انعام کی طمع نہ ہو، کسی پر اعتماد و توکل نہ ہو، کسی کی طرف الٰہیت اور ربوبیت کو منسوب نہ کیا جائے، کسی کو نافع و ضار نہ سمجھا جائے، کسی سے عبدیت کا تعلق وابستہ نہ کیا جائے۔ اسی کا نام "ایمان" ہے۔

دوسرے اپنی زندگی کے اختیاری شعبہ میں اس معبود کے حکم شرعی کی اسی طرح اطاعت کرنا جس طرح اضطراری شعبہ میں اس کے حکم تکوینی کی اطاعت کی جاتی ہے، تاکہ ساری زندگی ایک ہی فرمانروا، ایک ہی حکومت اور ایک ہی قانون کی تابع فرمان ہو کر ہم رنگ و ہم آہنگ ہو جائے، اور اس میں کسی حیثیت سے بھی دورنگی اور ناہمواری باقی نہ رہے۔ اسی کو "عمل صالح" کہتے ہیں۔

غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ یہ عبادت صرف تسبیح و مصلّٰی اور مسجد و خانقاہ تک محدود ہے۔ مومن صالح صرف اسی وقت اللہ کا عبادت گذار نہیں ہوتا جب وہ دن میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اور بارہ مہینوں میں ایک مہینہ کے روزے رکھتا ہے، اور سال میں ایک وقت زکوٰۃ دیتا ہے اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے۔ جب وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں سے بچتا اور حلال کی روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا؟ جب وہ معاملات میں ظلم اور جھوٹ اور فریب اور دغا سے پرہیز کر کے انصاف اور راست بازی سے کام لیتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا؟ جب وہ خلق خدا کی خدمت اور حق داروں کی حق رسانی کے لیے کمربستہ ہوتا ہے تو کیا اس کی ہر حرکت عین عبادت نہیں ہوتی؟ جب وہ اپنے افعال و اقوال میں خدا کے قانون کی پیروی کرتا اور اس کے حدود کا لحاظ رکھتا ہے تو کیا اس کا ہر قول و فعل عبادت میں شمار نہ ہوگا؟ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو کام بھی کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے، حتیٰ کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے۔

مگر یہ عبادت کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ اس عبادت کی مثال ایسی ہے جیسے رعیت کے عام افراد اپنے بادشاہ کے قانون کی پیروی اور اس کے فرامین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس سے بڑا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مالک کا نوکر بن جائے، اور اس کے قوانین کی نہ صرف خود پیروی کرے بلکہ دوسروں پر بھی ان کو نافذ کرنے کی کوشش کرے، اس کے احکام پر نہ صرف خود عامل ہو بلکہ دنیا میں ان کے اجراء کے لیے بھی جدوجہد کرے، اس کی حکومت میں نہ صرف خود امن اور وفاداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ رہے، بلکہ اپنے دل اور دماغ اور دست بازو کی قوتوں کو امن قائم کرنے اور سرکش رعایا کو وفادار بنانے اور باغیوں کو اطاعت کی طرف کھینچ لانے میں بھی صرف کرے، اور اس خدمت میں اپنا تن من دھن سب کچھ نثار کردے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲: ۱۷)	اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بہترین عادل قوم بنایا تاکہ تم لوگوں پر نگران ہو اور رسول تم پر نگران ہو۔
هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ (۲۲: ۱۰)	اسی نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی، تاکہ رسول تم پر نگران ہو اور تم لوگوں پر نگران ہو پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے رسّے پر جمے رہو۔
اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۲۲: ۶)۔	وہ جن کو اگر ہم زمین میں طاقت بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

یہ ہے اس عبادت کی حقیقت جس کے متعلق لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض نماز روزہ اور تسبیح و تہلیل کا نام ہے اور دنیا کے معاملات سے اس کو کچھ سروکار نہیں۔ حالانکہ دراصل صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اور

ذکر و تسبیح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے مستعد کرنے والی تمرنیات ہیں جو انسان کی زندگی کو حیوانی زندگی کے ادنیٰ مقام سے اٹھا کر انسانی زندگی کے بلند ترین مقام پر لے جاتی ہے اور اس کو اضطرار و اختیار دونوں میں اپنے مالک کا مطیع و فرمانبردار بندہ بنا دیتی ہے اور اسے بادشاہ حقیقی کی سلطنت کا ایسا ملازم بناتی ہے جس کی خدمت وہ اپنے جسم و جان کی ساری قوتوں کے ساتھ اپنی زندگی کے ہر لحہ میں کرتا ہے۔ جب انسان عبادت کے اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو وہ شرف حاصل ہوتا ہے جس میں کائنات کی کوئی مخلوق اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ملائکہ تک اس کے مقام سے فروتر ہوتے ہیں وہ دنیا میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اس کو خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت نہیں دی جاتی۔ اس کی گردن میں خدا کی غلامی کے سوا کسی کی غلامی کا طوق نہیں ہوتا۔ اس کے پاؤں میں خدا کی زنجیر کے سوا کسی کی زنجیر نہیں ہوتی۔ اس کا سر خدا کے حکم کے سوا کسی کے حکم کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ خدا کا غلام اور سب کا آقا ہوتا ہے۔ وہ خدا کا محکوم اور سب کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کو خدا کی طرف سے اس کی زمین پر حکومت کا حق حاصل ہو جاتا ہے وہ فرعون و نمرود کی طرح باغی اور غاصب نہیں ہوتا۔ بلکہ شاہی فرمان سے زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے اور حق کے ساتھ فرمانروائی کرتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا	تم میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا	کیے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو یقیناً زمین
اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ	میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو
لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ	بنا چکا ہے اور ضرور ان کے دین کو جسے اس نے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا	ان کے لیے پسند کیا ہے مضبوطی کے ساتھ قائم کرے گا
يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا (۲۴:۵۵)	اور بالیقین ان کی حالت خوف کو امن سے بدل

دے گا بس وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

یہ تو دنیا کا انعام ہے۔ اور آخرت کا انعام کیا ہے۔؟ یہ کہ

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۴: ۷)

اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اور اللہ سے ڈرا اور اس کے غضب سے بچا، تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (۲۴: ۵)۔

وہ لوگ جن کو کوئی تجارت اور کوئی خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی، وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جب دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پھر جائیں گی۔ ان کو امید ہے کہ اللہ ان کے اعمال کا بہتر سے بہتر بدلہ دیگا اور اپنے فضل سے اس پر مزید اضافہ کرے گا۔

افسوس کہ عبادت کے اس صحیح اور حقیقی مفہوم کو مسلمان بھول گئے۔ انہوں نے چند مخصوص اعمال کا نام عبادت رکھ لیا، اور سمجھے کہ بس انہی اعمال کو انجام دینا خدا کی عبادت ہے اور انہی کو انجام دے کر عبادت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس عظیم الشان غلط فہمی نے عوام اور خواص دونوں کو دھوکے میں ڈال دیا۔ عوام نے اپنے اوقات میں سے چند لمحے خدا کی عبادت کے لیے مختص کرکے باقی تمام اوقات کو اس سے آزاد کر لیا۔ قانون الٰہی کی دفعات میں سے ایک ایک دفعہ کی خلاف ورزی کی حدود اللہ میں سے ایک ایک حد کو توڑا، جھوٹ بولے، غیبت کی، بدعہدیاں کیں، حرام کے مال کھائے، حق داروں کے حق مارے، کمزوروں پر ظلم کیا، نفس کی بندگی میں دل، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سب کو نافرمانی کے لیے وقف کر دیا، مگر پانچ وقت نماز پڑھ لی، زبان اور حلق کی حد تک قرآن کی تلاوت کر لی، سال میں مہینہ بھر کے روزے رکھ لیے، اپنے مال میں سے کچھ خیرات کر دی، ایک مرتبہ حج بھی کر آئے اور سمجھے کہ ہم خدا کے عبادت گزار بندے ہیں۔ کیا اسی کا نام خدا کی عبادت ہے؟ اس کے سجدے سے سر اٹھاتے ہی ہر معبود باطل کے آگے جھک جاؤ

اس کے سوا ہر زندہ اور مردہ کو حاجت روا بناؤ، ہر اس بندے کو خدا بنا لو جس میں تم کو نقصان پہونچانے یا نفع دینے کی ذرّہ برابر بھی قوت نظر آئے، روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے کفار و مشرکین تک کے آگے ہاتھ جوڑو اور ان کے پاؤں چومو، انہی کو رازق سمجھو، انہی کو عزت اور ذلت دینے والا سمجھو، انہی کے قانون کو قانون سمجھو اس لیے کہ وہ طاقت رکھتے ہیں، اور خدا کے قانون کو بے تکلف توڑ دو اس لیے کہ تمہارے زعم باطل میں وہ اپنے قانون کو نافذ کرنے کی قوت نہیں رکھتا۔ کیا یہی تمہارا اسلام ہے؟ یہی تمہارے ایمان کی شان ہے؟ اسی پر تمہیں گمان ہے کہ تم خدا کی عبادت کرتے ہو؟ اگر یہی اسلام اور ایمان ہے اور یہی اللہ کی عبادت ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس نے تم کو دنیا میں ذلیل و خوار کر رکھا ہے؟ کیا چیز ہے جو تم سے خدا کے سوا ہر در کی گدائی کرا رہی ہے؟ کس چیز نے تمہاری گردنوں میں غلامی اور ذلت کے طوق ڈال رکھے ہیں؟

خواص نے اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ تسبیح و مصلی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے خدا کے بندے گمراہی میں مبتلا ہیں، دنیا میں ظلم پھیل رہا ہے، حق کی روشنی پر باطل کی ظلمت چھائی جا رہی ہے، خدا کی زمین پر ظالموں اور سرکشوں کا قبضہ ہو رہا ہے، الٰہی قوانین کے بجائے شیطانی قوانین کی بندگی خدا کے بندوں سے کرائی جا رہی ہے، مگر یہ ہیں کہ نفل پر نفل پڑھ رہے ہیں تسبیحوں کو گردش دے رہے ہیں، ھو حق کے نعرے لگا رہے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں۔ مگر صرف ثواب تلاوت کی خاطر۔ حدیث پڑھتے ہیں، مگر صرف تبرک کا۔ سیرت پاک اور اسوۂ صحابہ پر وعظ فرماتے ہیں، مگر قصہ گوئی کا لطف اٹھانے کے سوا کچھ مقصود نہیں، دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق نہ ان کو قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں نہ سیرت پاک میں نہ اسوۂ صحابہ میں۔ کیا یہ عبادت ہے؟ کیا عبادت یہی ہے کہ بدی کا طوفان تمہارے سامنے اٹھ رہا ہو اور تم آنکھیں بند کیے ہوئے مراقبہ میں مشغول رہو؟ کیا عبادت اسی کو کہتے ہیں کہ گمراہی کا سیلاب تمہارے حجرے کی دیواروں سے ٹکرا رہا ہو اور تم دروازہ بند کر کے نفل پڑھے جاؤ؟ کیا عبادت اسی کا نام ہے کہ کفار چار دانگ عالم میں شیطانی فتوحات کے ڈنکے بجاتے پھریں، دنیا میں انہی کا علم پھیلے، انہی کی حکمت کار فرما ہو

انہی کا قانون رواج پائے، انہی کی تلوار چلے، انہی کے حکم کے آگے بندگان خدا کی گردنیں جھکیں اور تم خدا کی زمین اور خدا کی مخلوق کو ان کے لیے چھوڑ کر نمازیں پڑھنے، روزے رکھنے اور ذکر و شغل کرنے میں منہمک ہو جاؤ؟ اگر عبادت یہی ہے جو تم کر رہے ہو، اور اللہ کی عبادت کا حق اسی طرح ادا ہوتا ہے تو پھر یہ کیا بات کہ عبادت تم کرو اور زمین کی حکومت و فرمانروائی دوسروں کو ملے؟ کیا معاذ اللہ خدا کا وہ وعدہ جھوٹا ہے جو اس نے قرآن میں تم سے کیا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ وَلَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (۲۴ : ۵۵)۔ اگر خدا اپنے وعدہ میں سچا ہے، اور اگر یہ واقعہ ہے کہ تمہاری اس عبادت کے باوجود نہ تم کو زمین کی خلافت حاصل ہے نہ تمہارے دین کو تمکنت نصیب ہے، نہ تم کو خوف کے بدلے میں امن میسر آیا ہے، تو تم کو سمجھنا چاہیے کہ تم اور تمہاری ساری قوم عبادت گذار نہیں بلکہ تارک عبادت ہے، اور اسی ترک عبادت کا وبال ہے جس نے تم کو دنیا میں ذلیل کر رکھا ہے۔

علیہ السلام
قصہ حضرت یوسف
توریت اور قرآن کے بیانات کا موازنہ

(۲)

از جناب مولوی ابو اللیث شیر محمد صاحب ندوی

(۳) توریت اور قرآن کے بعض بیانات میں سخت اختلاف اور تناقض پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ تحریف تدلیس، تخلیط اور نسیان کی وجہ سے واقعات کی اصلی صورت، اکثر جگہ باقی نہیں رہی اور ان کی نوعیت بدل گئی، ایسے موقع پر مذکورہ بالا اصول کے مطابق، قرآن کا بیان صحیح تسلیم کرنا واجب ہے کیونکہ یہ متواتر ہے اور ہر قسم کی کمی و زیادتی سے محفوظ ہے بخلاف توریت کے کہ خود یہودی علماء نے اس کا غیر محفوظ اور محرف ہونا تسلیم کرلیا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں توریت کا جو بیان، قرآن سے مخالف نظر آتا ہے، غور کرنے کے بعد وہ عقل اور توریت کی بعض شہادتوں کے بھی مخالف نظر آتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر تحریف بائبل کے لیے اور کوئی دلیل نہ ملے تب بھی اس کو محرف یقین کرنے کے لیے، ان اختلافات پر غور کرنا کافی ہے۔ یہاں میں اس کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

(۱) توریت کا بیان ہے کہ جس وقت، عورت نے یوسف سے ہم بستر ہونے کو کہا تو وہ اپنا پیراہن اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ گئے، اس عورت نے جب یہ دیکھا کہ اس نے اپنا پیراہن میرے ہاتھ میں رہنے دیا اور بھاگ نکلا تو اپنے گھر والوں کو بلایا اور کہا کہ وہ عبرانی غلام اندر گھسا تھا کہ میرے ساتھ ہم بستر ہو لیکن میں چلا اٹھی اس لیے وہ اپنا پیراہن میرے ہاتھ میں چھوڑ کر باہر نکل گیا، یہی باتیں اس نے اپنے شوہر کے سامنے

بھی بیان کیں جس کو سنکر وہ بہت برافروختہ ہوا اور یوسف کو قید کر دیا، تکوین باب ۳۹ آیت ۱۱ تا ۱۹۔

قرآن کا بیان اس سے مخالف ہے، قرآن میں ہے کہ دروازہ کی طرف دونوں لپکے، یوسف بھاگنے کے لیے اور وہ عورت ان کو پکڑنے کے لیے، لیکن دروازہ پر پہنچکر دونوں نے اپنے آقا کو سامنے پایا، عورت نے انتہائی چالاکی کے ساتھ، سارا الزام یوسف کے سر تھوپ دیا کہ انہوں نے میرے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا تھا لیکن خود اسی کے کسی عزیز کے فیصلہ کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت ثابت ہوگئی اس لیے عزیز نے یوسفؑ کو اعراض کا حکم دیا اور عورت کو سرزنش کی۔

یہاں دو اختلاف پائے جاتے ہیں۔ پہلا اختلاف یہ ہے کہ توریت کے بیان کے مطابق اسی الزام میں حضرت یوسفؑ کو قید کر دیا گیا لیکن قرآن کی رو سے الٹی اس عورت ہی کو سرزنش ہوئی۔ دوسرے یہ کہ توریت میں ہے کہ "اصرار" اور "انکار" کے بعد جب حضرت یوسفؑ دامن بچا کر نکل گئے تو گھر والوں کو اس واقعہ کی خبر تک نہ ہوئی لیکن عورت نے گھر والوں کو خود بلا کر حضرت یوسفؑ پر بدنیتی کا الزام لگایا، مگر قرآن کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عزیز کو یا گھر والوں کو نہیں بلایا بلکہ اتفاقاً دروازہ کی طرف لپکنے کے وقت عزیز دروازہ پر مل گیا اس لیے اس کو شوہر کی بدگمانی سے بچنے کے لیے یہ بات بنانی پڑی۔ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا الخ۔ اس شخص کی کیا سزا ہے جو آپ کی بیوی کے ساتھ بدنیتی کرے۔

توریت کے یہ دونوں بیان خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا اس لیے کہ خود توریت کے بیان کے مطابق، عزیز مصر حضرت یوسفؑ کی للہیت اور خداترسی کا بہت قائل تھا اس لیے ان کو بہت عزیز رکھتا تھا، توریت تکوین باب ۳۹۔ آیت ۳ تا ۵ میں ہے کہ۔

"جب اس کے (یعنی یوسف کے) آقا نے دیکھا کہ خداوند اس کے ساتھ ہے اور یہ کہ خداوند نے اس کے سب کاموں میں اسے اقبال مند کیا۔ چنانچہ یوسفؑ اس کی نظر میں مورد لطف ہوا اور اس نے اس کی خدمت کی اور اسے اپنے گھر پر نائب کر دیا اور سب کچھ جو اس کا تھا اس کے قبضہ میں کر دیا" کیا یہ ممکن ہے کہ عزیز مصر

اس اعتماد، اعتقاد اور اعتراف خلوص وخدا ترسی کے بعد، محض ایک عورت کے کہدینے کی وجہ سے، خواہ وہ عورت کیسی ہی معتبر کیوں نہ ہو، بغیر کسی قسم کی شہادت اور تحقیق حالات کے بے دریغ ان کو قیدخانے میں بھیجدیتا، جیسا توریت میں ہے؟ میرے خیال میں ہر شخص اس کا انکار کرے گا۔ نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ایسے موقع پر حضرت یوسفؑ کو قید کرنا، خود اپنی تشہیر اور بدنامی کا سامان کرنا تھا۔ اس لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ یوسفؑ کو قید کرکے، عزیز نے خود اپنی تشہیر اور بدنامی پسند کی ہو، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق جب خود عورت کا گناہ ثابت ہوگیا تو زیادہ سخت سزا کے بجائے جس کی وہ اس موقع پر مستحق تھی، عزیز نے معمولی سرزنش پر اکتفا کرلیا، کیونکہ سزا کی صورت اختیار کرنے میں اس معاملہ کے پھیل جانے اور مشہور ہوجانے کا ڈر تھا، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہاں یہ شبہہ ہو کہ اگر قیدخانہ میں بھیجنا باعث تشہیر تھا تو پھر قرآن کے بیان کے مطابق، کیوں عزیز نے بعد میں ان کو قید کردیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تشہیر کے بعد کا واقعہ ہے جب بات شہر کی گلی کوچوں میں عام ہوگئی تو پھر اس پر پردہ ڈالنے کی سعی بے سود تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر حضرت یوسفؑ کو قید کرنا ہی تشہیر اور بدنامی کو روک سکتا تھا

توریت کا دوسرا بیان بھی خلاف عقل ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عورت حضرت یوسفؑ پر فریفتہ تھی اور دل وجان سے ان پر فدا، دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ان کو رسوا کرنے، ذلیل کرنے بلکہ قید ومحن میں مبتلا کرنے کا سامان بھی، یہ الزام لگاکر مہیا کردیا۔ دراں حالیکہ توریت کے بیان کے مطابق "خلوت" خانہ کی کارروائیوں کو کسی نے دیکھا بھی نہ تھا کہ کہا جائے کہ اس نے اپنے کو فضیحت سے بچانے کے لیے، ان کی رسوائی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ چشم فلک نے اس قسم کا عشق تو غالباً کبھی نہ دیکھا ہوگا اب تک تو یہ سمجھتے آئے تھے کہ عشاق پر فراق کی گھڑیاں بہت شاق گزرتی ہیں۔ اس لیے وہ وصل میں بھی فراق کے خوف سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔ لیکن اگر توریت کا یہ بیان صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ عشق کی نئی قسم سمجھی جائے گی کہ عاشق دعوائے عشق کے باوجود، خود محبوب کی جدائی کا خواہاں اور اس کے مواقع

جویاں ہے غلط فہمی میں پڑنے سے بچنے کے لیے، یہاں یہ بات، یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ خود قرآن کے بیان میں ہے کہ عورت نے حضرت یوسف کے خلاف بدنیتی کے الزام میں قید خانہ یا کسی سخت سزا کی تجویز پیش کی (مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ) لیکن تورات۔ اور قرآن کے بیان میں یہ فرق ہے کہ قرآن کے بیان کے اعتبار سے اس نے ایسا مجبوراً کیا، اس وقت جبکہ اپنی ذات کو بدنامی اور رسوائی سے بچانے کے لیے سوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا، اگرچہ یہ چیز بھی آئین عشق کے خلاف ہے لیکن عورت سمجھ کر اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ توریت کے بیان کے مطابق اس نے ایسا بغیر کسی مجبوری کے کیا۔

اس خاص موقع کے علاوہ قرآن سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس عورت نے پھر کبھی یوسف ؑ کو قید خانہ بھیجنے کی خواہش یا کوشش کی ہو، دھمکی البتہ دی ہے اور یہ چیز قابل اعتراض نہیں البتہ لوگوں نے بعض وجوہ سے ان کو قید خانہ میں بھیج دینا مناسب سمجھا۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ الخ۔ اس موقع پر بھی اگرچہ اس نے اپنی فطری کمزوری کی بنا پر اپنے کو رسوائی سے بچانے کے لیے یوسف ؑ کی کوئی پرواہ نہیں کی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ موقع اس عورت کے لیے بہت زیادہ نازک تھا۔ ایک طرف عقل و ہوش کی دعوت تھی، دوسری طرف عشق و محبت کی۔ لیکن وہ اپنے عشق میں خام تھی اس لیے ہوش کی دعوت کو قبول کر کے اپنے کو رسوائی سے بچانے کے لیے یوسف ؑ کو متہم کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گفتگو میں عشق و محبت کی جھلک نمایاں ہے۔ ایک طرف اسے ڈر ہے کہ اگر اپنی صفائی نہ پیش کی جائے تو معلوم نہیں اس کا کیا نتیجہ ہو، دوسری طرف یہ خطرہ بھی دماغ پر مستولی ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے اس کے محبوب کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔ وہ اس وقت عجیب حیص بیص میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا اظہار اس کے اس جملہ إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ سے ہوتا ہے۔ اس نے اپنی براءت ثابت کرنے کے لیے یہ تو کہہ دیا کہ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا لیکن آگے اس کی زبان رک جاتی ہے اور یوسف ؑ کی محبت غالب آ جاتی ہے لیکن بہرحال اپنی براءت کرنی ہے، اس لیے قید کی خفیف سزا کی تجویز پیش کی إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ۔ لیکن پھر یہ خیال ہوتا ہے کہ

خفیف سزا کی تجویز سے کہیں عزیز یہ نہ سمجھ لے کہ واقعی دال میں کچھ کالا ہے اس لیے دل کڑا کر کے کہتی ہے اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ غور کیجئے کتنا نازک موقع تھا کہ اتنی احتیاطوں کے بعد بھی اس کے جملے اس کے قلب کی کیفیات کے آئینے ہیں۔

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق — حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

(۲) توریت میں ہے کہ قحط کے زمانہ میں جب یوسف کے بھائیوں کا قافلہ غلہ لانے کے لیے مصر پہنچا تو حضرت یوسف ؑ نے ان کو دیکھ کر پہچان لیا لیکن اس کے باوجود ان سے سختی سے گفتگو کی اور جاسوسی کے الزام میں، ان میں سے شمعون کو گرفتار کر لیا اور یہ کہا کہ جب تم اپنے چھوٹے بھائی کو میرے پاس لے آؤ گے تو میں تمہیں سچا سمجھوں گا۔ اور اس وقت شمعون کو رہا کر دوں گا (تکوین باب ۴۲) لیکن قرآن میں شمعون یا کسی اور کی گرفتاری کا کوئی ذکر نہیں بلکہ سیاق و سباق اور یوسف کے کلام کے طرز ادا سے اس کی نفی ہی متصور ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ الخ۔ حضرت یوسف ؑ کی گفتگو سے ملاطفت اور مدارات کا اظہار ہو رہا ہے، یہی نہیں بلکہ دام محبت میں گرفتار کر کے دوبارہ مصر واپس بلانے یا اس کے لیے سہولت پیدا کرنے کی غرض سے یہ حکم دیتے ہیں کہ اِجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے کسی کو گرفتار نہیں کیا اور نہ ان پر کسی قسم کی سختی کی بلکہ اس کے برعکس شفقت سے اُن کو رام کرنا چاہا۔ اگر واقعی انہوں نے ان میں سے کسی کو گرفتار کیا ہوتا تو طرز گفتگو یہ نہ ہوتا۔ غرضکہ قرآن سے اشارۃً یا کنایۃً کسی طرح بھی شمعون کی گرفتاری ثابت نہیں۔ اب آئیے توریت کا مذکورۂ بالا بیان عقل اور توریت کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے

قرآن اور توریت کی تصریحات سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف ؑ بہت زیادہ عادل اور منصف تھے۔

اور کیوں نہ ہو جبکہ منصب نبوت پر فائز تھے، کیا ایسے منصف مزاج اور عادل شخص سے ممکن ہے کہ اس علم کے باوجود کہ آنے والے اس کے بھائی ہیں[1]، ان میں سے شمعون کو جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیتا؟ یقیناً یہ بات حضرت یوسف کے منصب سے بہت گری ہوی ہے کہ ایک بے قصور کو خواہ مخواہ کے لیے گرفتار کر لیں۔ ایک مطلق العنان بادشاہ جھوٹا الزام قائم کر سکتا ہے، بے قصور کو سزا دے سکتا ہے بلکہ بے گناہوں کے خون سے اپنا ہاتھ بھی رنگین کر سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت یوسف بادشاہ ہی نہ تھے بلکہ خدا کے برگزیدہ نبی بھی تھے اس لیے ان سے کبھی اس قسم کا فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ یہاں پر ممکن ہے یہ سوال بعض لوگوں کے دل میں پیدا ہو کہ اگر ان سے یہ مستبعد ہے کہ شمعون کو جھوٹے الزام میں روک لیں تو یہ ان کے لیے کیونکر جائز ہوا کہ خود بن یامین کی گٹھڑی میں پیالہ رکھوا کر ان کو چوری کے الزام میں گرفتار کر لیں؟ یہ سوال کسی قدر پیچیدہ ہے اور تفصیل کا طالب لیکن مختصراً دونوں کا فرق سمجھنے کے لیے یہ مقدمہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر وہ کام جو کسی کی ایذا یا نقصان کا باعث ہو، سخت ترین گناہ ہے لیکن وہ کام جو بظاہر کسی کی تکلیف یا نقصان کا باعث ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہو تو وہ کام ہرگز گناہ نہیں سمجھا جائے گا۔ چونکہ شمعون کی گرفتاری، ان کی تکلیف کا باعث ہوتی اس لیے یہ گناہ سمجھا جائے گا جس سے انبیاء کرام منزہ ہیں اور بن یامین کے ساتھ جو کچھ کاروائی کی گئی وہ سب پہلے سے ان کو بتلا دی گئی تھی اور ان کی رضامندی حاصل کر لی گئی تھی اس لیے یہ گناہ کا کام نہیں سمجھا جائے گا۔

اس بیان کو توریت میں پڑھتے وقت، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہودیوں نے توریت میں اگرچہ قصداً یا بلا قصد بہت کچھ تحریفات کر دی ہیں لیکن اکثر مقامات پر خود توریت کی شہادتوں سے اس کا محرف ہونا معلوم ہو جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بعض کھلے ہوے مقامات پر کسی مصلحت سے تحریف کرنے کو تو کر دی یا بعض مقامات پر بلا قصد کمی یا زیادتی ہو گئی لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں اصلیت علی حالہ باقی رہی جس کا علم بوجہ خفی دلالت کے ان کو نہ ہو سکا یہی باتیں بسا اوقات اصلیت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ توریت میں

[1] تکوین باب ۴۲ - آیت ۷۔

اگرچہ ذبح کے موقع پر، اسماعیل کی جگہ پر اسحاق کا نام لکھ دیا گیا ہے لیکن علامہ حمید الدین مرحوم نے اسی اصول کے ماتحت، توریت ہی کی مخفی شہادتوں سے حضرت اسماعیل کا ذبیح ہونا اس طرح ثابت کر دیا ہے کہ اس میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا ملاحظہ ہو الرای الصحیح فیمن ہو الذبیح۔ بعینہٖ یہی صورت یہاں بھی ہے اگرچہ توریت میں تخلیط، تدلیس، یا سہو وغیرہ کی وجہ سے شمعون کو روک لینے کا واقعہ درج ہوگیا ہے لیکن خود توریت کی بعض اندرونی شہادتیں اس کے خلاف ہیں جن کو میں مختصراً بیان کرتا ہوں، میرا یہ خیال حسب ذیل بنیاد پر قائم ہے۔

(۱) حضرت یعقوب ؑ شمعون سے بہت محبت کرتے تھے، اس کی شہادت خود توریت میں ہے کہ شمعون کی قید کے بعد جب ان کے بھائیوں نے، کنعان آکر پورا واقعہ اپنے والد سے سنایا تو انھوں نے نہایت حسرت وغم سے یہ کہا: ۔ تم نے مجھے لاولد کیا، یوسف تو نہیں ہے اور شمعون بھی نہیں ہے بن یامین کو بھی لے جاؤ گے یہ چیزیں میرے مخالف ہیں (پیدایش باب ۴۲۔ آیت ۳۶)۔

(۲) توریت کا بیان یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے اگرچہ شمعون کو روک لیا تھا لیکن کنعان واپس جانے والے بھائیوں کے ساتھ زاد راہ اور کھانے کے لیے کافی غلہ کر دیا تھا۔ کنعان پہنچکر وہ اور ان کے باپ کھانے پینے میں مصروف ہوگئے یہانتک کہ جب غلہ ختم ہونے لگا تو یعقوب ؑ نے اپنے بیٹوں کو پھر مصر جاکر غلہ لانے کے لیے کہا اور ان کے حکم کے مطابق، وہ بن یامین کو ساتھ لے کر گئے لیکن اتنی مدت کے بعد گئے کہ وہ دو مرتبہ مصر جا آسکتے تھے (پیدایش باب ۴۳۔ آیت ۱۰)

(۳) حضرت یعقوب نے جس وقت، اپنے بیٹوں کو مصر جانے کے لیے کہا تو صرف غلہ لانے کو غرض قرار دیا شمعون کی رہائی کا ذکر نہیں کیا۔ باب ۴۳۔ آیت ۲ میں ہے کہ "یوں ہوا کہ جب وہ غلہ جو مصر سے لائے تھے، وہ کھاچکے تو ان کے باپ نے انہیں کہا کہ پھر جاؤ اور ہمارے لیے تھوڑی خورش مول لو۔ اسی طرح جب یہودا نے مصر پہنچکر، عزیز مصر کے سامنے، اپنے سفر کی غرض وغایت بیان کی تو اگرچہ پورے اہتمام کے ساتھ حضرت یعقوب کی پوری گفتگو بیان کی لیکن مصر جانے کا حکم دیتے وقت اپنے والد کا صرف یہ جملہ بیان کیا کہ

ہمارا باپ بولا پھر جاؤ اور ہمارے لیے تھوڑا غلہ مول لاؤ۔ (باب ۴۴۔ آیت ۲۶)

مذکورہ بالا مقدمات کو اگر سامنے رکھکر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ شمعون کی گرفتاری کی داستان خلاف واقع ہے۔ غور کیجیے کہ اگر شمعون کو عزیز مصر نے روک لیا ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ حضرت یعقوبؑ باوجود شمعون کی محبت کے جس کا ثبوت باب ۴۲۔ آیت ۳۶ سے ہوتا ہے، کھانے پینے میں مشغول ہو کر ان کو بھول جاتے اور ان کی رہائی کی کوئی فکر نہ کرتے اور اپنے لڑکوں کو اسی وقت مصر بھیجتے جب کھانے کے لیے کچھ باقی نہ رہ جاتا اور اس لیے بھیجتے کہ وہاں جا کر غلہ لائیں نہ کہ اس لیے کہ شمعون کی رہائی کے لیے کوئی تدبیر کریں؟ اگر واقعی وہاں شمعون مقید ہوتے تو یقیناً حضرت سننے کے ساتھ ہی ان کی رہائی کی فکر کرتے اور اپنے لڑکوں کو اس کے لیے مصر بھیجتے اور اتنی تاخیر ہرگز گوارا نہ کرتے کہ دو مرتبہ قافلہ مصر جا کر واپس آسکے، اسی طرح اگر واقعی شمعون وہاں گرفتار ہوتے تو اپنے لڑکوں کو مصر بھیجتے وقت کم از کم حضرت یعقوبؑ یہی فرما دیتے کہ "ذرا شمعون کا بھی خیال کرنا" لیکن توریت میں ان چیزوں کا کہیں تذکرہ نہیں ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ بن یامین کو چونکہ وہ اپنے سے جدا کرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے مصر بھیجنے میں اتنی تاخیر کردی لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ اگر غلہ کے حصول کے لیے وہ بن یامین کو بھائیوں کی شرط کے مطابق مصر بھیجنے پر تیار ہو سکتے ہیں تو یقیناً وہ لخت جگر کی رہائی کے لیے بھی ان کو بھیجنے پر تیار ہو جاتے۔ اس صورت میں کسی طرح اسے گوارا نہ کرتے کہ ان کی رہائی کی تدبیر اتنے دن تک ملتوی رکھیں کہ قافلہ دو مرتبہ مصر جا آسکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ توریت کی یہ زیادتی عقل اور توریت کی بعض مخفی شہادتوں کے سراسر خلاف ہے بلکہ توریت باب ۴۴ آیت ۱۸ تا ۳۴ میں بن یامین گرفتاری کے بعد یہوداہ نے عزیز مصر کے ساتھ جو گفتگو کی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو اس میں کچھ شبہہ باقی نہیں رہتا کہ شمعون کی گرفتاری کی داستان بالکل بے سر و پا ہے طوالت کے خوف سے میں یہاں اس کا اقتباس درج نہیں کرتا لیکن ناظرین اگر ذرا غور سے اس کو ملاحظہ فرمائیں تو ان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ توریت میں اس مقام پر اصلیت بہت زیادہ آ گئی ہے

اور یہی وجہ ہے کہ یہاں توریت اور قرآن میں بہت زیادہ مشابہت پیدا ہوگئی ہے

(۳) قرآن میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے، اپنے بھائی کو پیالہ کی چوری کے الزام میں اپنے پاس روک لیا اور اگرچہ ان کے بھائیوں نے، ان کی جگہ پر اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کیا لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے یہ کہکر انکار کر دیا اِنَّا اِذًا لَّظَالِمُوْنَ۔ اس کے بعد جب وہ مایوس ہوگئے تو آپس کے مشورہ کے بعد بڑا وہیں رک گیا اور بقیہ سب لوگ کنعان واپس آئے اور یعقوب کو تمام حالات کی اطلاع دی۔ وہ سنکر بہت غمگین ہوئے لیکن اب بھی وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے اور کہا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا اور اپنے لڑکوں کو یوسف اور بن یامین کی جستجو کے لیے یہ کہکر مصر روانہ کیا کہ اِذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اس مرتبہ جب وہ مصر پہنچکر حضرت یوسف کے سامنے آئے تو انھوں نے اپنا یوسفؑ ہونا ظاہر کر دیا۔

اب اس کے مقابل میں توریت کا بیان ملاحظہ ہو، توریت کا بیان اِنَّا اِذًا لَّظَالِمُوْنَ۔ کہنے تک قرآن سے بالکل مطابق ہے اور دونوں صحیفوں میں شدید معنوی اور لفظی مشابہت پائی جاتی ہے لیکن اس کے بعد سے توریت کا بیان مختلف ہوجاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ بڑے بھائی کے سوا سب کنعان اپنے والد کو واقعہ کی اطلاع دینے چلے جاتے ہیں۔ اور جب پھر مصر واپس آتے ہیں تو اس مرتبہ یوسف ان پر کھلتے ہیں لیکن توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر نے جب ان کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا تو وہ گھر لوٹ کر نہیں جاتے بلکہ وہ سب کے سب وہیں مقیم رہتے ہیں اور یہوذا، عزیز مصر کے دربار میں جاکر، اجازت لے کر اپنے خاندان کے درد و غم کی داستان اس طریقہ سے بیان کرتا ہے کہ حضرت یوسف سنکر بے قرار ہوجاتے ہیں دونوں بیانوں کو سامنے رکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ قرآن کا بیان زیادہ نیز زیادہ موثر اور سبق آموز ہے کیونکہ وہ اصلیت پر مبنی ہے اور توریت کے بیان کے اندر سطحیت نمایاں ہے کیونکہ اس میں واقعہ کی اصلی صورت محفوظ نہیں۔

سب سے پہلے اس پر غور فرمائیے کہ اس قصہ کے بیان کا مقصد، آنحضرتؐ کے سامنے یعقوبؑ اور یوسف علیہما السلام کے شدائد و مشکلات کو بیان کرکے، دونوں کے صبر و شکیبائی اور بالآخر شاندار نتیجہ کے ظہور کو دکھلانا مقصود ہے تاکہ آپ کو مشرکین عرب کی ایذا رسانیوں اور استہزاؤں پر صبر آجائے۔ قرآن کے بیان کے مطابق یہ مقصود بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے اور دونوں کے صبر کا پہلو زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ خیال فرمائیے کہ یعقوب علیہ السلام کو، لخت جگر یوسف کی گمشدگی کے بعد، دوسرے نور نظر کی گرفتاری کی خبر پہونچتی ہے، دل، غم سے پاش پاش ہوجاتا ہے لیکن پھر بھی فرماتے ہیں اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ اور اپنے لڑکوں سے فرماتے ہیں وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ لیکن توریت کے اعتبار سے حضرت یعقوبؑ کو اس جانگداز اور روح فرسا واقعہ کی اطلاع ہی نہیں پہونچتی۔

دوسری بات اس واقعہ میں قابل لحاظ یہ ہے کہ قرآن کی رو سے حضرت یوسفؑ، صبر و قرار کے انتہائی مرتبہ پر پہونچے ہوئے تھے، اسی بنا پر گو انہیں، اپنی زندگی میں، بھائیوں کی وجہ سے متعدد صبر آزما مشکلات سے دوچار ہونا پڑا لیکن سب کو انہوں نے صبر اور استقلال کے ساتھ انگیز کیا یہ صبر ہی کا ایک گوشہ تھا کہ انھوں نے اس موقع پر، اپنے نفس کو قابو میں رکھا جہاں بڑے بڑے لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، یہ صبر ہی کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ طول طویل فراق کے بعد، یاران وطن سے نہیں بلکہ حقیقی بھائیوں سے ملاقات ہوتی ہے لیکن پہچاننے کے بعد بھی، ان پر اشتیاق یا بے قراری کا کوئی ایسا اثر ظاہر ہونے نہیں پاتا جس سے لوگ کچھ پتہ پاسکیں۔ یہ صبر ہی کا نمونہ تھا کہ ان کی پہلی ملاقات کے بعد رخصتی کا منظر دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی دل کی بیقراری کو دبائے رکھتے ہیں توریت کے اعتبار سے بھی بھائیوں کو دیکھ کر اور ان کی باتوں کو سن کر، کئی کئی مرتبہ بے قرار ہوجاتے ہیں لیکن ضبط نفس کا یہ حال ہے کہ لوگوں کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا۔ کیا یہ انتہائی صبر کا نمونہ نہیں؟ ان کے بھائی ان پر چوری کا الزام لگاتے ہیں۔ وَاِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ۔ لیکن صاحب اختیار ہونے کے

باوجود خاموشی اختیار کرتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے (فَاَسَرَّهَا یُوسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ) کیا یہ معمولی آدمیوں سے ممکن ہے۔ صبر و استقلال کے ان حیرت انگیز واقعات کے بعد مشکل سے باور کیا جاسکتا ہے کہ وہ یہوذا کی باتیں سنکر بے قرار ہوگئے اور بے قابو ہوکر اپنا یوسف ہونا ظاہر کردیا یہ چیز حضرت یوسفؑ کی صفات کے خلاف ہے اور ایسا ماننے سے ان مصالح کا تار و پود بلا قصد بکھر جاتا ہے جن کی وجہ سے حضرت یوسفؑ نے اتنے دنوں تک اپنے کو چھپائے رکھا۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کے بیان کے اعتبار سے، حضرت یوسفؑ نے تیسری مرتبہ ان کے آنے پر مناسب اور برمحل جانکر، اپنا یوسف ہونا ظاہر کردیا، یہ نہیں ہے کہ بے قرار ہوکر انھوں نے ایسا کیا، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، قرآن کی عبارت یہ ہے۔ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ، قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوسُفَ وَاَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ۔ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوسُفُ، قَالَ اَنَا یُوسُفُ۔ ان جملوں پر غور کیجئے کیا اس سے ان کی بے قراری ثابت ہوتی ہے یا ان سے انکا استقلال ٹپکتا ہے۔

اس بیان میں تیسری چیز قابل غور یہ ہے کہ خود توریت کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس روکنے کے لیے یہ تدبیر کی کہ ان کی گٹھڑی میں پیالہ رکھوا کر ان کو چوری کے الزام میں روک لیا۔ اب اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے کو اسی موقع پر ظاہر کردیا تو یہ تدبیر بے نتیجہ اور عبث ہوجاتی ہے۔ قرآن کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے، ان باتوں پر غور کرنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توریت میں بیچ سے واقعہ کے بعض اجزا، غائب ہوگئے ہیں۔ بن یامین کی گرفتاری کے بعد یوسفؑ کے سامنے آکر یہوذا نے جو کچھ کہا ہے، ممکن ہے صحیح ہو لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت کہا ہوگا جب کنعان سے دوبارہ واپس آئے (جیسا کہ توریت میں اسی کے مشابہ گفتگو موجود ہے) نہ کہ مصر سے روانہ ہونے سے قبل جیسا کہ توریت میں ہے، چونکہ توریت میں کمی زیادتی ہوئی ہے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ بیچ سے اتنی عبارت حذف ہوگئی ہو کہ "وہ لوگ اس واقعہ (یعنی بن یامین کی گرفتاری) کی اطلاع دینے

کے لیے کنعان گئے لیکن اُن کے والد نے ان کو یوسف اور بن یامین کی جستجو کے لیے پھر مصر روانہ کیا۔ وہ جب مصر آئے تو یہوداؔ نے بادشاہ کے دربار میں پہنچکر یہ کہا (باب ۴۴۔ آیت ۱۸) اور یہ سنکر یوسف نے اپنے کو ظاہر کر دیا۔" اس صورت میں قرآن اور توریت بالکل متفق ہو جاتے ہیں بلکہ قرآن کے اس جملہ کی کہ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَاَوْفِ الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا کے اجمال کی تفصیل بھی ہو جائے گی۔

(۴) چوتھا اختلاف یہ ہے کہ قرآن میں ہے کہ جب تمام درباری، بادشاہ کے خواب کی تعبیر سے عاجز ہو گئے تو ساقی کو حضرت یوسفؑ یاد آئے کیونکہ وہ ان کی صداقت دیکھ چکا تھا اس لیے وہ بادشاہ سے اجازت طلب کرکے، دربار سے باہر آتا ہے اور خود جاکر پہلے یوسف سے خواب کی تعبیر دریافت کرتا ہے اور پھر آکر بادشاہ کے سامنے بیان کرتا ہے لیکن توریت میں یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کے سامنے ہی حضرت یوسفؑ کا تذکرہ کیا، جس کی بنا پر بادشاہ نے ان کو قید خانے سے بلایا اور خواب اور خواب کی تعبیر دریافت کی۔ یہاں بھی قرآن ہی کا بیان قرین قیاس اور قابل قبول معلوم ہوتا ہے کیونکہ ساقی کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ خواب، کوئی آسان خواب نہیں ہے بلکہ اتنا پیچیدہ ہے کہ تمام لوگ اس کی تعبیر بتانے سے عاجز ہو گئے ہیں اور خواب پریشان کہکر سب نے اپنا پیچھا چھڑا لیا ہے۔ اس لیے اس کی احتیاط اور یوسف کے ساتھ اس کی خیر خواہی کا تقاضا یہی تھا کہ اطمینان بخش تعبیر حاصل کیے بغیر یوسف کا نام نہ لیا جائے۔ اس لیے اس نے اپنے کو مورد عتاب ہونے سے بچانے کے لیے پہلے خواب کی تعبیر حاصل کی ہوگی اور اس کے بعد یوسف کا تذکرہ کیا ہوگا نیز یہ معلوم ہے کہ توریت کے بیان کے اعتبار سے حضرت یوسفؑ تہمت میں قید خانے میں ڈال دیئے گئے تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ ساقی یوسف کا گرویدہ، احسانمند اور ان کا خیر خواہ تھا، اس لیے اس نے خیر خواہی کی غرض سے 'انکا نام نہ لیا' اور دربار میں ان کا طلب کیا جانا' مناسب نہ سمجھا کہ مبادا وہ بھی تعبیر بتانے سے قاصر رہیں اور مورد عتاب ہونے کے علاوہ' ان کو دیکھکر بادشاہ اور درباریوں کی

غصہ تازہ ہو جائے۔

(۵) پانچواں اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق، جب ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر دریافت کرکے، بادشاہ کو بتادی تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور یوسف کو قید خانے سے بلا بھیجا لیکن انہوں نے اپنی بے گناہی ثابت کیے بغیر، قید خانے سے نکلنا مناسب نہ سمجھا اس لیے پیغام لانے والے سے فرمایا۔ اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَاسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اور جب پوری طرح ان کی براءت ثابت ہوگئی تو قید خانے سے نکلے اور بادشاہ کے دربار میں تشریف لے گئے، بادشاہ ان کی عقل و دانائی، عصمت و پاکدامنی اور صبر و استقلال سے بہت متاثر ہوا اور ان کو حکومت پر سرفراز کیا لیکن توریت کا بیان یہ ہے کہ جب بادشاہ کے خواب کا کوئی تعبیر بتانے والا نہیں ملا تو ساقی نے جو یوسف کے ساتھ قید خانے میں رہ چکا تھا، یوسف کا پتہ بتایا۔ حضرت یوسف قید خانہ سے بلائے گئے، وہ خوشی خوشی کپڑے بدل کر دربار میں گئے اور خواب کی تعبیر بتائی۔ بادشاہ نے خوش ہوکر ان کو حکومت مصر عطا کر دی اور خود نام کا بادشاہ بنا رہا۔ ملاحظہ ہو توریت کتاب پیدائش باب ۴۱۔ آیت ۴۰-۴۴۔

ان دونوں بیانوں کے موازنہ کی ضرورت نہیں۔ ادنیٰ تامل ہر شخص کو، توریت کا بیان خلاف عقل نظر آئے گا۔ حضرت یوسفؑ کی عقل و فرزانگی اور ان کے صبر و استقلال سے جس کا ثبوت انہوں نے اپنی زندگی میں بار بار دیا اور جس کی تعریف خود آنحضورؐ نے ان الفاظ میں فرمائی لَوْ کُنْتُ ...... لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ۔ یہ بعید ہے کہ بغیر اپنے کو اس الزام سے بری ثابت کیے ہوئے، جس کی بنا پر آپ قید خانہ میں ڈال دیے گئے ہیں یا جس سے آپ متہم قرار دیے گئے ہیں، بادشاہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسی طرح یہ بھی بعید ہے کہ ملک مصر، ایسے شخص کو تخت و تاج سونپ کر، خود دستبردار ہو جائے گا جو ایک جرم میں قید کر دیا گیا ہے۔ بادشاہ کا یہ اقدام، خود دلالت کرتا ہے کہ اس نے آپ کے اندر کسی قسم کی برائی نہیں پائی اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ بادشاہ کی طلب پر، زنان مصر نے خود ان کی پاکدامنی کی شہادت

دی ہو جیسا کہ قرآن میں ہے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ توریت کا مذکورہ بالا بیان غلط ہے۔

(۶) ایک خفیف اختلاف یہ ہے کہ توریت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی شکیم میں بکریاں چرانے گئے حضرت یعقوبؑ نے انکو وہاں یوسفؑ کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ ان کے بھائی ان سے حسد کرتے تھے اور ان سے جلے بھنتے تھے، انہوں نے حضرت یوسفؑ کو جب آتے دیکھا تو ان کی ہلاکت کی مختلف تدبیریں سوچنے لگے اور آنے پر انہوں نے ایک کنویں میں ڈال دیا لیکن قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوب نے، یوسفؑ کو نہیں بھیجا بلکہ ان کے بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے خواہش ظاہر کی کہ ان کو ہمارے ساتھ جنگل میں جانے دیجئے تاکہ وہ ہمارے ساتھ کھیلے کودے اور پھل کھائے حضرت یعقوبؑ بمشکل تمام عہد و پیمان کے بعد ان کو ساتھ روانہ کرنے پر راضی ہوئے۔ دونوں بیانوں میں اختلاف ہے لیکن قرین قیاس، قرآن کا بیان ہے کیونکہ حضرت یعقوبؑ ان کے حسد و بغض سے واقف تھے جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف کا خواب سننے کے ساتھ ہی فرما دیا: لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ الخ۔ نیز توریت میں ہے کہ ان کے بھائی ان سے اس حد تک بغض رکھتے تھے کہ ان سے سلام و کلام کے بھی روادار نہ تھے جیسا کہ توریت کتاب پیدائش باب ۳۷ آیت ۴ سے ثابت ہے۔ جب ان کا حسد و بغض اس حد تک پہنچ چکا تھا تو ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو اس کی خبر ضرور رہی ہوگی۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت یعقوبؑ ان کے اس حسد و بغض کے علم کے باوجود ان کو جنگل میں بھیج دیں۔ جہاں معلوم ہے کہ ہر قسم کی ہلاکت کے سامان، بھائیوں کے مشورہ کے بعد کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تو یوسف کا دشمن ہی کر سکتا ہے لیکن یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو محبت تھی وہ مسلم ہے یہ بالکل ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ان اختلافات کے علاوہ بعض اور خفیف اختلافات بھی پائے جاتے ہیں جن کو میں بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں اخیر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان تمام خرابیوں کے باوجود، قرآن کے سمجھنے کے لیے، توریت کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں، بسا اوقات توریت سے قرآن سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے اور اکثر جگہ توریت سے

قرآن کے اجمال کی تفصیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ جب یوسف کے بھائیوں کا قافلہ پہلی مرتبہ مصر آیا تو یوسف نے ان سے کہا کہ ائتونی باخ لکم من ابیکم۔ اس سے پہلے، بھائی باپ وغیرہ کا تذکرہ کوئی نہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے تو اپنا یوسف ہونا تو ظاہر نہیں کیا تھا۔ پھر کیوں کر بغیر تذکرہ کیے، ان سے بھائی کو ساتھ لانے کے لیے کہا، توریت میں دیکھنے سے یہ سوال دور ہو جاتا ہے اور حضرت یوسفؑ کے طلب کی تقریب سمجھ میں آجاتی ہے۔ اسی طرح قرآن، جا بجا بنی اسرائیل کا تذکرہ مختلف حیثیتوں سے اپنے اسلوب کے مطابق اشارۃً کرتا ہے۔ عرب کے لوگ چونکہ تمام واقعات سے واقف تھے اس لیے ان کے لیے اشارہ کافی تھا، لیکن ہم درحقیقت تمام اشاروں اور اجمالوں کی تفصیل معلوم کرنے کے محتاج ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔

لیکن درحقیقت توریت کے مطالعہ کے لیے خاص احتیاط اور تدبر سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ غلط راستہ پر پڑ جانا یقینی ہے۔ میرے خیال میں قرآن کی آیتوں میں متعدد احتمالات نکلتے ہیں، ان میں اس احتمال کو قوی سمجھنا چاہیے جو توریت کے بیان کے مطابق ہو جب تک کہ توریت کا بیان کسی عقلی یا نقلی دلیل کے مخالف نہ ہو۔ مثلاً قرآن کی مشہور آیت لقد همت به وهم بها لولا ان رای برهان ربه نہایت معرکۃ الآرا ہے اس کی تفسیر میں بعض مشہور مصنفین نے ایسی بے سر و پا باتیں لکھی ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ وہ کوئی افسانہ تصنیف کر رہے ہیں لیکن محققین نے کلیۃً اس کا انکار کیا ہے۔ اور آیت کی متعدد ایسی تاویلیں ہیں جن کی بنا پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا، توریت میں اگرچہ اکثر انبیاء کے متعلق زنا، بت پرستی وغیرہ کو نہایت بے باکی سے منسوب کر دیا گیا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ توریت بھی یوسفؑ صدیق کی عصمت کی صریح شہادت دیتی ہے (تکوین باب ٣٩ آیت ٧۔ ١٤) اس صریح شہادت کے بعد، حضرت یوسفؑ کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی صریح ظلم ہے۔ اسی طرح مفسرین عام طور پر، عزیز کو مالک مصر سمجھتے ہیں لیکن توریت میں تصریح ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں قرآن سے بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ابھی بہت سی چیزیں قابل بحث ہیں لیکن طوالت کے خوف سے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے

تنزیل و تاویل

سدرۃ المنتہیٰ

از جناب مولنا عبد اللہ العمادی

منت سدرہ و طوبیٰ ز پے سایہ مکش
کہ چو خوش بنگری اے سرو رواں این ہمہ نیست

(۱)

سدرہ کیا ہے؟ مفہوم متعین کرنے سے پہلے ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک سدرہ وہ ہے جس کا تذکرہ کلام اللہ میں ہے، اس کو سدرۃ المنتہیٰ کہتے ہیں، دوسرے سدرہ کا بیان حدیث نبویؐ میں ہے جسے سدرۃ النبی ہونے کا شرف حاصل تھا، ان دونوں کی دو مختلف حیثیتیں ہیں، مگر یہاں محض سدرۃ المنتہیٰ کی تحقیق مطلوب ہے۔ جس کے لیے گوناگوں روایتیں مذکور ہیں۔

(۱)۔ ھی شجرۃ فی اقصی الجنۃ الیھا ینتھی علم الاوّلین والاخرین۔

(۱) بہشت کے انتہائی حصہ میں ایک درخت ہے جس کو سدرہ کہتے ہیں اگلے پچھلوں کا علم وہیں تک پہنچ کے رہ جاتا ہے آگے نہیں بڑھتا۔

۲۔ اصلھا فی السماء السادسۃ ومعظمھا فی السابعۃ لم یجاوزھا احدٌ سوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھی عن یمین العرش

۲۔ شجرہ سدرہ کی جڑ تو چھٹے آسمان میں ہے مگر باقی سب ساتویں آسمان پر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اس سے آگے نہ بڑھا، یہ درخت عرش کے داہنے جانب ہے

۳- الیها ینتهی ما یعرج به من الارض فیفیض منها، والیها ما یهبط به من فوقها فیفیض منها۔

(۳) زمین پر سے جو چیزیں اوپر چڑھتی ہیں سدرۃ تک پہنچ کے رک جاتی ہیں اور پھر وہاں سے فیضان ہوتا ہے، اور جو اوپر سے نیچے آتی ہیں وہ بھی سدرۃ تک پہنچ کے رک جاتی ہیں اور پھر وہاں سے فیضان ہوتا ہے۔

۴- نبقها مثل قلال هجر وورقها مثل آذان الفیلة۔

(۴) یہ بیری کا درخت ہے، اس کے پھل علاقہ ہجر کے مٹکوں کے برابر ہوتے ہیں اور پتے جیسے ہاتھی کے کان۔

۵- یسیر الراکب فی ظل الفنن منها مائة عام ویستظل فی الفنن منها مائة الف راکب

۵- سوار اس درخت کی شاخوں کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے، اس کی شاخوں کے زیر سایہ ایک لاکھ سوار دھوپ سے بچے رہیں

۶- هی شجرة تحمل الحلی والحلل والثمار من جمیع الالوان، لو ان ورقة وضعت فی الارض لاضاءت لاهل الارض۔

(۶) اس درخت میں ہر رنگ کے زیور، حلے اور میوے لگے ہوئے ہیں، اگر اس کا ایک پتہ زمین پر رکھ دیا جائے تو روئے زمین کو روشن کر دے۔

۷- غشیها من امر الله فتحولت یاقوتا وزمردا۔

۷- سدرۃ المنتہی کو اللہ کے حکم نے ڈھانک لیا، اس نے شکل بدل لی، یاقوت و زمرد بن گیا۔

۸- یخرج من ساقها نهران باطنان فی الجنة ونهران ظاهران النیل والفرات۔

۸- سدرۃ المنتہی سے دو باطنی نہریں نکلتی ہیں اور دو ظاہری، باطنی نہریں تو بہشت میں ہیں اور ظاہری سے نیل و فرات ہیں۔

۹- ان ورقة منها غشت الامة کلها

۹- سدرۃ المنتہی کے ایک پتہ نے تمام امت کو ڈھانک لیا۔

۱۰- ما یستطیع احد ان یصفها

۱۰- سدرۃ المنتہی کی توصیف کوئی نہیں کر سکتا۔

۱- ایک روایت یہ ہے کہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت جبریل علیہ السلام بھی تھے، جاتے جاتے سدرۃ المنتہی تک پہونچ کے حضرت جبریل رک گئے، اس موقع پر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں

بدو گفت سالار بیت الحرام — کہ اے حامل وحی برتر خرام

بگفتا فراتر مجالم نماند | چہ بالم کہ نیروے بالم نماند
اگر یک سر موے برتر پرم | فروغ تجلّی بسوزد پرم

شاید اسی لیے ادب میں حضرت جبریل ؑ کا نشیمن سدرۃ المنتہیٰ قرار پایا اور ان کو طائر سدرہ کا خطاب ملا۔

(۱۲) پنجاب سے ایک مقدس بزرگ کی تازہ ترین تصنیف شائع ہوئی ہے جس کا نام "برہان القرآن" ہے اس میں ارشاد ہوتا ہے (ص ۱۵۹ و ۱۶۰)۔

"رسول خدا کے عہد نبوت میں دو کمانوں کی مقدار کا ایک شہاب ثاقب مکہ کی زمین کی انتہائی حد جنۃ الماوٰی کے پاس گرا، اس کی چمکتی ہوئی خاکستر سدرۃ المنتہیٰ پر پڑی، رب العالمین کی ان آیات کبریٰ کو رسول خدا نے عین وقت پر دیکھا اس وقت اس واقعہ کے متعلق یہ سورہ وحی کی گئی، اور اس میں اس گرنے والے تارے کے نظارے سے ثابت کیا کہ جو کچھ سورۃ طور میں تاروں کے متعلق نازل ہوا ہے اس کے لینے میں یہ رسول بہکا نہیں"

———— (۲) ————

سدرہ کا تذکرہ سورۃ النجم کی آیتوں میں ہے، پس وپیش سے بچنے کے لیے ان تمام آیات کی تلاوت کیجیے اور پھر تدبر فرمایئے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى . مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ	قسم ہے تارے کی جب ٹوٹا کہ تمہارا ساتھی نہ بھٹکا نہ بہکا
مَا غَوٰى، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ	اور نہ ہوا و ہوس سے باتیں بنائیں، یہ تو وحی ہے جو ان پر
اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى،	نازل ہوتی ہے، شدید قوتوں والے نے اس کو سکھایا ہے
ذُوْ مِرَّةٍ، فَاسْتَوٰى، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى	وہ طاقتور جو قائم ہو گیا اس حالت میں کہ افق اعلیٰ
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ	پر تھا، پھر قریب آیا پھر لٹک پڑا، پھر اتنا جھکا کہ بقدر دو
اَوْ اَدْنٰى، فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى۔	کمانوں کے فاصلہ رہ گیا، بلکہ اس سے بھی کم پھر اس نے

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ، أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ، وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ، عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ، عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ، إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ، مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ، لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ (۵۳: ۱-۱۱)

اپنے بندے پر جو وحی کرنی تھی کی، جو کچھ دیکھا اس نے دل میں کچھ جھوٹ نہیں ملایا، کیا تم اسی دیکھنے پر اس سے جھگڑتے ہو، اس نے تو دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس بھی دیکھا، جہاں جنت الماویٰ ہے، جب کہ سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا، اس دیکھنے میں نہ تو نظر بہکی نہ اچٹی، حقیقت میں اس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں

مولوی نذیر احمد صاحب اپنے ترجمۃ القرآن (طبع شمسی دہلی، ۱۳۲۲، ص ۵۶۰) کے حاشیہ پر شرح فرماتے ہیں۔

"سدرہ عربی میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ اور سدرۃ المنتہیٰ وہ بیری کا درخت ہے جو ساتویں آسمان پر ہے، اور جبرئیل جیسے مقدس فرشتے کی وہیں تک رسائی ہوتی ہے، اور یہ ساری باتیں داخل اسرار الٰہی ہیں، فہم بشر سے خارج۔"

کوئی شخص سدرۃ المنتہیٰ کی پوری طرح توصیف نہ کر سکے، تمام و کمال اس کی کیفیت بیان کرنے پر قادر نہ ہو، یہ ایک دوسری بات ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصل شئے غیر مفہوم ہے، فہم بشری سے اگر یہ بات خارج ہوتی تو قدمائے محدثین و مفسرین اس کی تفسیر ہی نہ کرتے۔

— ۳ —

صحابہ و تابعین سے اس میں تین طرح کی روایتیں ہیں۔

الف- سأل ابن عباس كعباً عن سدرة المنتهى فقال كعب انها سدرة على رؤس حملة العرش اليها

الف- عبد اللہ بن عباسؓ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ سدرۃ المنتہیٰ سے کیا مراد ہے کعب نے جواب دیا کہ یہ سدرہ حاملانِ عرش کے سروں پر ہے مخلوق کا علم یہیں تک پہنچ کے

إليها ينتهي علم الخلائق، ليس لأحد وراءها علم، ولذلك سميت سدرة المنتهى لانتهاء العلم إليها۔

رک جاتا ہے کسی کو اس کے اُدھر کا علم نہیں سدرۃ المنتہیٰ اسی لیے نام پڑا کہ یہیں تک علم کی انتہا ہے۔

ب۔ عن عبد الله قال لما أسري برسول الله صلى الله عليه وسلم انتهي به إلى سدرة المنتهى وهي في السماء السادسة إليها ينتهي من يعرج من الأرض (أو من) تحتها فيقبض منها وإليها ينتهي ما يهبط من فوقها فيقبض فيها۔

ب۔ عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسراء ہوا تو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو چھٹے آسمان میں ہے روئے زمین یا زیر زمین سے جو عروج و پرواز کریں ان سب کی حد یہی ہے، یہاں تک پہنچ کے رک جاتے ہیں، اسی طرح اوپر سے جو کچھ نیچے اترے وہ بھی یہاں پہنچ کر رک جائیگا۔

ج۔ عن أبي هريرة قال لما أسري بالنبي صلى الله عليه وسلم انتهى إلى السدرة فقيل له هذه السدرة ينتهي إليها كل أحد خلا من أمتك على سنتك۔

ج۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسراء ہوا تو سدرۃ پہنچ کے رک گئے، آنحضرت علیہ السلام کو اسی موقع پر اطلاع دی گئی کہ یہ سدرہ ہے، آپ کی امت کا جو شخص آپ کی سنت پر چلا یہی اس کی منزل ہے۔

۴

ابو جعفر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے جامع البیان (ج ۲۷ ص ۳۲،۳۳ - طبع بولاق ۱۳۲۹) میں تطبیق کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں۔

والصواب من القول في ذلك أن يقال: إن معنى المنتهى الانتهاء فكأنه قيل عند سدرة الانتهاء

جو اقوال نقل ہوئے ان سب میں قول صائب صحیح یہ ہے کہ منتہیٰ کے معنی انتہا کیے جائیں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس یعنی سدرۃ الانتہا کے پاس۔

وَجائزٌ ان یکون قیل لھا سدرة المنتھٰی لانتھاء علم کل عالم من الخلق الیھا۔

سدرۃ المنتہیٰ کہنا بھی جائز ہے، اس لیے کہ مخلوقات میں ہر ایک عالم کے علم کی وہاں تک پہنچ کے انتہا ہو جاتی ہے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

وجائزٌ ان یکونَ قیل ذٰلک لھا لانتھاء ما یصعد من تحتھا ینزل من فوقھا الیھا۔

یہ بھی جائز ہے کہ سدرہ کو منتہی اس لیے کہا گیا ہو کہ صعود ونزول دونوں کی آخری حد وہی ہے۔

وَجائزٌ ان یکون قیل ذٰلک لانتھاء کل من خلا من الناس علی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیھا۔

یہ بھی جائز ہے کہ سدرہ کو منتہی اس لیے کہا گیا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے جو لوگ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت پر چلے ہوں اُن کی انتہا وہیں ہے۔

وجائزٌ ان یکون قیل ذٰلکَ لھا لجمیع ذٰلک ولاخبرٌ یقطع العذر بانہ قیل ذٰلک لبعض ذٰلک لھا دون بعض۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ لفظ ان تمام معانی پر ہو اور سب اس سے مراد ہوں دلیل قاطع کے طور پر کوئی ایسی روایت موجود نہیں کہ اس لفظ کے یہ معنی تو ہیں مگر یہ نہیں ہیں۔

یہ تو منتہی کے معنے ہوئے، سدرہ کے کیا معنی ہیں، ائمہ عربیت ہی اس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

۵

جس زمانہ میں کلام اللہ نازل ہوا ہے اس زمانہ کی عربی زبان میں سدرہ سے متعدد معنے مراد لیتے تھے۔

الف۔ سدرہ بیری کے درخت کو کہتے تھے۔

ب۔ دُوار، یعنی سر میں چکر آنا، حدیث میں ہے:۔ الذی یصدر فی البحر کالمتشحط فی دمہ۔

ج۔ کپڑے پھاڑنا۔

د۔ لانبے بال۔

ھ بے روک چلے جانا، بے پروائی، حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ نفر مستکبرا دخبط سادراً

۵- سمند رجب ساکن اور بے توجہ ہو، امیہ بن ابی الصلت کا شعر ہے :-

وکان برقع والملائک حولها سدرٌ تواکله القوائم اجردُ

برقع : اسماء۔ و سدر : البحر۔ شبه الملائکة فی خوفهامن الله بهذا الرجل السدر

۶- حیرت، گھبرا جانا، بصارت میں خیرگی آجانا، اسی لیے متحیر کو سادر کہتے ہیں۔

سدر سدرًا، لم یبصر۔

وَالسدر اسمدرارالبصر والتحیر۔

اس توضیح کی بنا پر سدرۃ المنتہیٰ کے معنی انتہائی حیرت کے بیان کیے گئے ہیں، ابن الخطیب اپنی تفسیر (مفاتیح الغیب۔ ج ۷، ص ۸۰۰۔ طبعۂ شرقیۃ مصر ۱۳۰۸) میں لکھتے ہیں:-

سدرة المنتهیٰ هی الحیرة القصویٰ۔	سدرۃ المنتہیٰ کا مطلب انتہائی حیرت ہے۔
یعنی عند مایحار العقل حیرة لاحیرة فوقها ماحار النبی صلی اللہ علیه وسلم وما غاب ورأی مارأی۔	کلام اللہ میں جہاں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھنے کا بیان ہے وہاں سدرۃ المنتہیٰ سے یہی مراد ہے کہ جب مقام عقل نہایت درجہ گھبرا اٹھے متحیر ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بھی متحیر نہ ہوئے، دیکھا جو دیکھا۔

اسی کے بعد اذ یغشی السدرۃ ما یغشیٰ کے معنی بیان کرتے ہیں۔

المراد من الغشیان غشیان حالة علی حالة، ای ورد علی حالة الحیرة حالة الرویة وَالیقین، ورای محمد صلی اللہ علیه وسلم عند ماحار العقل ما رآہ وقت ماطرأ علی تلك الحالة ماطرأ	سدرہ کو ڈھانک لینے سے مراد یہ ہے کہ ایک حالت کو دوسری حالت نے ڈھانک لیا، حیرت اور تحیر کی جو حالت تھی وہ مشاہدہ اور یقین کی حالت سے ڈھنک گئی، ایسی جگہ جہاں عقل متحیر ہو، ایسے وقت میں جو اپنے ساتھ تمام سامان حیرت رکھتا ہو، اللہ کے فضل و کرم سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رویت و شہود پر فائز ہوے مِنْ فَضْلِ اللهِ تَعَالیٰ وَرَحْمَة ۔

حسن بن محمد نیسابوری اپنی تفسیر (غرایب القرآن ورغائب الفرقان) میں تصریح کرتے ہیں۔

وَالمعنیٰ رآہ عند الحیرۃ القصویٰ ای فی وقت تحار عقول العقلاء فیہ ولکنہ مَاحار ولم یعرض لہ سدرٌ

کلام اللہ میں ہے" اس کو دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا" سدرۃ المنتہیٰ یعنی انتہائی حیرت، مطلب یہ ہے کہ ایسے وقت میں کہ عقلمند گھبرا اٹھیں عقلیں متحیر ہو جائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ بھی حیرت طاری نہ ہوی اور مشاہدہ میں کسی طرح کی خیرگی پیش نہ آئی۔

(٦)

یہ سب ہی لیکن رائے وقیاس کو روایت پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، روایات میں سدرہ کو درخت سدرہ ہی کہا گیا ہے، رہی اس کی حقیقت، تو جس طرح اشجار وانہار جنت کی حقیقت ہم متعین نہیں کر سکتے اس کو بھی اسی پر محمول کرلیجیے عقل والوں کو عقل مبارک، یہاں نقل ہی کافی ہے۔

ما بجامے کہ زجم ماند قناعت کردیم
بسکندر بدہید انچہ ز دارا ماند

تفسیر سورہ فلق

از جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔ تم کہو میں پناہ لیتا ہوں صبح کے رب کی ۔

اَعُوْذُ، پناہ لیتا ہوں ۔ لاکھ اعداء سے ہوشیار رہیں ۔ ان کے مکاسد سے واقف ہوں رات دن ان کے دفع میں سرگرم رہیں ۔ کیا ہوتا ہے ۔ دوڑو! اس کے ساحت قرب کی طرف دوڑو ۔ اس کے دامن عنایت میں چھپ رہو ۔ اس کی پناہ میں آجاؤ ۔ وہ سب کو نمٹ لے گا ۔ نیست و نابود کر دے گا ۔ اُس کی دوری ام الشرور ہے، رب الفساد ہے ۔

رب ۔ پروردگار پالنے والا ۔ کمال تک پہنچانے والا ۔ یہ نہیں کہ صرف پیدا کر دیا ۔ اب تم آزاد ہو ۔ نہیں تم کو ہر آن، ہر لحظہ اسی کی ضرورت ہے ۔ اعطاء وجود و کمالات میں اس کی حاجت ہے، تم سراپا محتاج ہو وہ بالکل محتاج الیہ ہے ۔ نہ تمہاری ذاتی صفت تم سے جاتی ہے ۔ نہ اس کی ذاتی صفت اس سے منفک ہوتی ہے ۔ جب تم ہر آن محتاج ہو تو ہر آن محتاج الیہ کی طرف توجہ کرو ۔

اَلْفَلَق ۔ تاریکی میں سے روشن چیز کا نکلنا ۔ پو پھٹنا صبح ہونا ۔ دانے میں سے موکلے کا نکلنا یہاں ہو سکتا ہے کہ فلق سے مراد صبح ہو ۔ کیونکہ جب صبح کو گہری نیند میں لوگ پڑے خراٹے لیتے ہیں، اس غفلت کی حالت میں چور آتے ہیں اور لوٹ مار کر لے جاتے ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ فلق سے مراد ظلمت عدم سے نور وجود کا حاصل ہونا ہو ۔ یہ قرآن ہے، ہر اعتبار میں پورا اترتا ہے ۔ ہر شخص کی جدا ضرورت ہوتی ہے، اور یہ سب کی ضرورت پوری کرتا ہے ۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۔ ہر اس شئے کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا ہے ۔

شر، برائی، بدی۔ ہر شئے جو ضرر رساں ہو۔ جو کسی کو اس کے کمال سے روکے، یا جس میں خود کچھ کمی ہو، وہ شر ہے۔

یہ یاد رکھو کہ وجود خیر ہے۔ اور عدم شر۔ جو وجود محض ہے وہ خیر محض ہے۔ ظاہر ہے کہ وجود محض خدا تعالیٰ ہے، تو خیر محض بھی وہی ہوگا۔ عدم محض موجود ہی نہیں ہو سکتا تو شر محض بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ خدائے تعالیٰ کے سوا جتنے موجودات ہیں ان میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہیں۔ یہ خیر اضافی کہلاتا ہے بعض اشیاء میں خیر غالب ہوتا ہے، اور شر مغلوب بعض میں اس کا عکس۔ اس کو خیر کثیر اور شر کثیر کہتے ہیں۔ خیر کثیر قابل تحصیل ہے، شر کثیر قابل اجتناب۔ مثلاً تجارت سے نفع اٹھانا خیر کثیر ہے، باوجودیکہ اس میں سخت تکلیف اور بڑی محنت ہے۔ خیانت، رشوت، سود خواری، چوری میں شر کثیر ہے، باوجودیکہ ان میں محنت کم ہے اور راحت زیادہ۔

اس خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ ہم مذہبی لوگ ہیں۔ ہمارے نزدیک تو جس کا حکم خدا اور رسول دے وہ خیر ہے۔ اور جس سے منع کرے وہ شر ہے۔

آخر یہ شر پیدا کہاں سے ہوا؟ کیا خدا سے پیدا ہوا؟ ہرگز نہیں۔ وہ خیر محض ہے۔ اس سے شر کیونکر پیدا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ سلسلۂ تکوین میں جو واجب حق سے قریب تر ہوگا وہ خیر تر ہوگا، اور جو بعید تر ہوگا، وہ شر تر ہوگا۔ انسان کا پہلا نقطہ جہاں سے اس کا ارادہ چلتا ہے، انتہائے نقطۂ شر ہے۔ اس کے بعد انسان ترقی کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ واجب جل مجدہٗ سے جس قدر قریب ہوتا جائیگا اُسی قدر خیر ہوتا چلا جائیگا۔

آخر یہ شر مخلوق خدا ہے یا نہیں؟ خدائے تعالیٰ سے وجود حاصل ہوتا ہے جو خیر ہے۔ مگر ایک تعین دوسرے تعین کے لحاظ سے شر ہو جاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا قصد اولین خیر ہے۔ بالعرض شر ہو، ہو جائے۔ پھر تم جس کو شر سمجھ رہے ہو اس میں بھی ہزار در ہزار خیر ہے۔ شر قلیل کے خیال سے خیر کثیر کو چھوڑنا بھی شر کثیر ہے۔ نظام عالم پر غور کرو۔ جو کچھ ہو رہا ہے خیر ہی ہو رہا ہے۔ مہندس کی نظر میں بیت الخلا کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی طاقات کے کمرے کی۔ اور نہانے کا کمرہ اتنا ہی خیر ہے جتنا کتب خانے کا کمرہ۔ ہمارے خیال میں تو تعین شر کا مرکز ہے۔

جتنا خدا کی طرف بڑھوگے، پھیلتے جاؤگے۔ خیریت بڑھے گی۔ شریت گھٹے گی۔ تم سے نفع عام حاصل ہوگا تمہارا ذاتی فائدہ بھی خدا کے لیے ہوگا، اور اس سے دوسروں کو بھی فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ تمہارا جینا بچیز ہوگا اور مقصد خلق پورا ہوگا۔

خلق۔ خلق کے معنی ہیں اندازہ کرنا۔ پیدا کرنا۔ کبھی خلق کہتے ہیں اور اس سے مراد ماسوای ذات۔ وصفات حق تعالیٰ لیتے ہیں، خواہ ارواح ہوں خواہ اجساد۔ اس محاورے پر ارواح واجساد سب مخلوق ہیں۔ کبھی خلق کہتے ہیں اور اس کو عالم امر کے مقابل سمجھتے ہیں۔ عالم خلق تحت زمانہ ہوتا ہے، اور مخلوق تدریجاً کمال حاصل کرتا ہے۔ اس کے لیے استعدادات مشروط ہیں۔ عالم امر تحت زمانہ نہیں ہوتا۔ اس میں جو ہیں ان کے پیدا ہونے میں نہ استعداد شرط ہے نہ وہ زمانے کے تحت ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کا کن فرما دینا موجودات کے لیے کافی ہے۔ یہی حقیقت روح ہے یہی امر رب کی تحقیق ہے اور سوال از روح کا مکمل جواب۔

من شر ما خلق میں ارشاد ہے کہ شر جانب مخلوق سے ہے نہ کہ جانب خلق و وجود و نور سے کہ وہ تو خدا کی جانب سے ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ اور شر سے ظلمت کے جب وہ چھا جائے۔ رات کی تاریکی میں سانپ بچھو، شیر چیتے، چور اور ڈاکوؤں کا زور ہوتا ہے۔ شیاطین اور جن کا جھپیٹا بھی رات ہی کو ہوتا ہے۔ نیز انسان کے مخلوق ہونے کے بعد خود اس کے قویٰ جو اس کی حیات کے مدار ہیں، اس کے اندرونی دشمن بھی ہیں۔ جہاں ایک نے سر اٹھایا اور جینا مہلکہ اور تہلکہ میں پڑگیا۔ احساسات اپنے کام میں لگاتے ہیں۔ متخیلہ و مفکرہ چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ دائماً گورکھ دھندے میں پھانسے رکھتی ہیں۔ یہ بھی ایک ظلمت ہے جو دل پر چھائی ہوی ہے۔ پھر جب دل میں نور ایمان پیدا ہوتا ہے تو باہر کے دشمن ایک طرف، اور ظلمت غفلت دوسری طرف، اس نور پر ہجوم کرتے ہیں۔ طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ شبہات کا حملہ ہوتا ہے،

ہمیشہ ایمان میں تزلزل کا خوف لگا رہتا ہے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ اور شر سے پھونکنے والی عورتوں یا جماعتوں کے گرہوں میں

النَّفْثُ، پھونکنا پھلانا۔ نفخ اور نفث میں فرق یہ ہے کہ نفث میں رطوبت بھی ہے۔

عُقَدْ جمع ہے عقدہ کی، بمعنی گرہ، نیت ارادہ۔ عناصر وارکان (خون، صفرا، بلغم، سودا)

کا باہم ملکر مزاج پیدا کرنا۔ قوائے باطنہ کا اعتدال۔

ساحرہ عورتیں بالوں میں گرہ دیکر، منتر پڑھ کر مسحور کر دیتی ہیں۔ نیز عناصر وارکان جو باہم ملکر گرہ

لگا کر مزاج پیدا کر دیتے ہیں، کبھی ان میں سے ایک یا دو بڑھ کر فساد پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ نیز خواہشات

نفسانی و قوت عقلی بڑھ کر مکر و گربزی و دھار، اور کم ہو کر جہل و بلادت و سفاہت بن جاتی ہیں۔ قوت غضبی

زیادہ ہو کر تہور اور من چلاپن اور کم ہو کر جبن بزدلی اور نامردی ہو جاتی ہے۔ قوت شہوی زیادہ ہو کر حرص

وشرہ اور کم ہو کر جمود و مردہ دلی بن جاتی ہے۔ ان امراض نفسانی سے بھی بچنا ضرور ہے۔ اور ان سے استعاذہ لابد

نیز جب بندہ اعمال صالح کی نیت کرتا ہے تو واہی تباہی خطرات اس کے ارادوں میں داخل ہو کر ان کو تباہ

کرتے ہیں۔ یا شیاطین الانس والجن بہکا کر، پھسلا کر نیک ارادوں کو چلنے نہیں دیتے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ شر سے حاسدوں کے جب وہ حسد کریں۔

کسی شخص کی کامیابی کو لوگ ٹھنڈے دل سے دیکھ نہیں سکتے۔ مختلف طور سے ستاتے، بدنام کرتے اکی کامیابی

میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ سب سے زیادہ حاسد ہمارا آبائی دشمن ظلمت کا بادشاہ ہے۔ صاحب علم ایسا کہ فرشتوں کی بھی

استادی کی۔ خفیہ مکار ایسا کہ اس کی چال کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جب ہمارے باپ کو جنت سے نکلوا چکا ہے تو

بھلا ہم کو جنت میں کس طرح داخل ہونے دیگا۔ اللہ ہی اس کے شر سے بچائے تو بچائے۔ لہذا اس ظالم کے شر سے بھی

استعاذہ ضروری ہے۔ خدا ہمارا اس کا دونوں کا مالک ہے۔ اس کتے کو ڈانٹ دے گا! پھر کیا مقدور کہ ہم پر

حملہ کر سکے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

حاملانِ قرآن

شیخ معین الدین عمادی

(از جناب مولوی محمد عثمان صاحب۔ بی ایس سی (علیگ)

صبح خیزی و سلامت طلبی چون حافظ
ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم

محمد نام، معین الدین خطاب، قاضی طیب کے فرزند تھے۔ علم بغیر تعلّی، فقر بغیر مسکنت، تواضع بغیر تذلل، عفو بغیر کبر، تحدیث نعمت بغیر فخر، عزت اسلامی پر افتخار بدون استکبار، مزاج میں شاہی، پیشانی پر نور الٰہی، ذات و الاصفات جامع جمیع حسنات تھی "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔" کی دعا آپ پوری ہوئی۔ بارہ سیر حاصل قریات آپ کے مِلکِ یمین تھے جن کے محاصل وقفِ فلکِ رتبہ، اطعام جائع، اِلباسِ معتر، اغاثۂ مظلوم، وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔ امرنوا میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں محل سرائیں تعمیر کرائیں، لیکن آپ ایک درخت کے تلے فرش خاک پر آرام فرمایا۔ سنگ لحد علم ہے۔ یزار و یتبرک بہ۔

حضرت شیخ عبدالقدوس قلندر سے آپ کو اجازت خلافت حاصل تھی"۔ خود آپ کے خلفاء کا خصیصہ یہ تھا کہ سب کے سب۔ من غیر استثناءِ۔ عالم حامل، کتاب وسنت کے حامل تھے۔ نضر اللہ وجوھہم

ماہیت جن حلقہ درس تنزیل میں ایک روز "جن" کی تاویل ہو رہی تھی، ایک جماعت سلب اور دوسری ایجاب پر زور دیتی تھی، موجبین فلسفہ یونان سے مدد لیتے اور آیات قرآن سے سند لاتے، سالبین اس فلسفہ کو

سفسطہ بتاتے اور نصوص کو مأوّل ٹھیراتے" بحث جب منفصل نہ ہو سکی تو دونوں فریق حضرت سے رجوع ہوئے فاحکم بیننا بالحق - فرمایا:-

رئیس فلاسفہ اسلام ابن سینا اپنے رسالہ "حدود الاشیاء" میں فرماتے ہیں۔

الجنّ حیوانٌ ھوائیٌ متشکّلٌ باشکالٍ مختلفۃ	جن ایک ہوائی جاندار مخلوق ہے جو طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

وھذا شرحٌ لِلاسمِ	یہ صرف نام کی تشریح ہے۔

یعنی

ان ھذا الحد شرحٌ للمراد من ھذا	اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ لفظ جن سے مراد کیا ہے۔
اللفظ ولیس لھذہ الحقیقۃ وجود فی الخارج	ورنہ خارج میں اس حقیقت کا کہیں وجود نہیں۔

فرمایا:-

فلسفہ جو چاہے کہے، وحی الٰہی وجود جن کی مثبت ہے، مگر اسی قدر کہ یہ بھی خدا کی ایک مخلوق ہے، یہ مخلوق کیسی ہے، کیا ہے، اور کہاں ہے، کلام اللہ اس باب میں ساکت ہے۔

عرض کی:-

سورۂ جن شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ایک بڑی جماعت جن حاضر ہوئی، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے ملاقات کی اور استماع آیات کے بعد وہ واپس گئے۔

فرمایا، سورۂ جن کی آیتیں پڑھو۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ	اے پیغمبر کہو کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ
فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْٓ	"جن" کے بعض افراد آیات قرآنی سن کر بول اٹھے ہم نے ایک
اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا	عجیب قرآن سنا جو راہ راست دکھاتا ہے، ہم تو اُس

ایمان لائے اور اپنے پروردگار کے ساتھ ہم کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے۔

دیکھو:۔

(۱) پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ کہنے کا حکم ہوتا ہے کہ بعض افراد جن کلام اللہ سن کے خوش ہوئے

(۲) آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس واقعہ کا علم وحی الٰہی سے ہو۔

(۳) جناب نبوی میں اس موقع پر جن کا آنا اور آنحضرت سلام اللہ علیہ کا اُن سے ملاقات کرنا قرآن مجید سے ثابت نہیں۔

اذ لو راٰھم لما اسند معرفۃ ھذہ الواقعۃ الی الوحی فان ما عرف وجودہ بالمشاھدۃ لا یسند اثباتہ الی الوحی۔

اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کو دیکھا ہوتا تو آپ اس واقعہ کو وحی کی طرف منسوب نہ کرتے، جس کا وجود مشاہدہ میں آگیا اس کا ثبوت وحی سے دینے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) آیت میں نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ ہے، یعنی جن کی ایک چھوٹی سی جماعت۔

فان النفر فی کلامھم جماعۃٌ من الثلاثۃ الی العشر۔

کلام عرب میں نفر کا اطلاق اسی جماعت پر ہوتا ہے جو تین سے دس تک کی ہو۔

علم غیب عرض کی:۔

یہ تو آغاز سورۃ تھا، انجام اظہار غیب پر ہے کہ اللہ ہی عالم الغیب ہے، وہ اپنے علم غیب پر مطلع نہیں کرتا، ہاں مگر اپنے برگزیدہ پیغمبر کو، یہ تو نفی کرامات اولیاء اللہ کی دلیل ہوئی، کیونکہ اولیاء اللہ کی سب سے بڑی کرامت تو عوام اسی کو سمجھتے ہیں کہ ان مقدسین کو مغیبات پر دسترس ہے اور ان سے غیب کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

فرمایا یہ زمخشری کا قول ہے جو لکھتے ہیں۔

وفی ھٰذا ابطال الکرامات لان الذین

اس آیت میں اولیاء اللہ کی کرامات کے باطل ہونے

تضاف الکرامات الیھم وان کانوا اولیاً مرتضین فلیسوا برسل وقد خص اللہ الرسل من بین المرتضین بالاطلاع علی علم الغیب۔

کی جانب اشارہ ہے اس لیے کہ جن نفوس قدسیہ کی جانب کرامات کو منسوب کرتے ہیں وہ چاہے ولی ہوں برگزیدہ ہوں بہرحال پیغمبر تو نہیں اللہ تعالیٰ نے تو اپنے برگزیدہ بندوں میں سے فقط پیغمبروں کو یہ خصوصیت بخشی ہے کہ علم غیب سے انھیں کو مطلع کرے گا۔

فرمایا:۔ مفسرین نے اس پر بڑی بحث کی ہے جس کا خاتمہ اسی طرح ممکن ہے کہ پوری آیتیں تلاوت کیجائیں

پیغمبر ضرر و نفع کا مالک نہیں قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۔

کہو کہ میں تمہارے لیے نہ کسی ضرر پر دسترس رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی پر۔

پیغمبری کی حد قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِهٖ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا۔

کہو کہ مجھے خدا سے کوئی ہرگز نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا ہرگز کوئی پناہ پا سکتا ہوں، بجز اس کے کہ اللہ کی طرف سے حکم پہنچانا اور اس کے پیغاموں کا ادا کرنا یہی میرا کام ہے، جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی تو حقیقت میں اس کے لیے آتش دوزخ ہے، ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھیں گے جس کی وعید ان سے کی گئی ہے تو اس وقت جانیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کی جماعت کم ہے

قیامت کا علم قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ

کہو کہ میں نہیں جانتا جس چیز کی تم سے وعید کی گئی ہے آیا وہ نزدیک ہے یا میرے پروردگار نے اس کے لیے کوئی مدت دراز مقرر کر رکھی ہے، غیب کا جاننے والا وہی ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ

یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۔

پیغمبر کو، تو اس پیغمبر کی آگے اور پیچھے سے محافظت کرتا ہے تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے اللہ نے جو کچھ ان کے آس پاس ہے سب کا احاطہ کر لیا ہے اور تمام موجودات کا اس نے شمار رکھا ہے۔

حاشیہ | "احصٰی کُلَّ شَیْءٍ" لان الشیء عندنا ھو الموجودات والموجودات متناھیة فی العدد وھٰذہ الآیة احد ما یحتج بہ علی ان المعدوم لیس بشیء وذٰلک لان المعدوم لو کان شیئا لکانت الاشیاء غیر متناھیة۔

میں "شیٔ" کا ترجمہ ہم نے تمام موجودات کیا ہے اس لیے کہ اہل سنت کے نزدیک شیٔ سے مراد موجودات ہی ہے اور موجودات اپنی تعداد میں متناہی ہیں، عدم کے شیٔ نہ ہونے پر جو دلیلیں قائم کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ آیت بھی ہے اس لیے کہ معدوم اگر شی ہو تو پھر اشیاء کو غیر متناہی یعنی بے شمار ماننا پڑیگا حالانکہ یہاں شے کو شمار پذیر فرمایا ہے۔

فرمایا:-

ان آیات سے واضح ہے کہ یہاں جس علم غیب کا بیان ہے وہ علم وقوع قیامت ہے۔

قیامت کب ہوگی؟ مشرکین اس پر بحث کرتے ہیں کہ جس عذاب قیامت کی ہمیں دھمکی دی جاتی ہے آخر اس کے وقوع کا زمانہ بھی کبھی آئے گا۔

جواب ملتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ قیامت، جس کے عذاب کی وعید تمہیں کی گئی ہے، نزدیک ہے یا اس کی مدت دراز ہے اسی کو ایک دوسرے مقام پر ایک دوسرے ہی پیرایہ میں ظاہر کیا ہے:-

وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ۔ تم کیا جانو عجب نہیں کہ قیامت قریب ہو۔

بہرحال اسلام میں اجماع ہے کہ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، البتہ وہ اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہے کچھ آگاہ بھی کر سکتا ہے۔

یہاں مطلق علم غیب مراد نہیں، ایک طرح کا مخصوص علم غیب مقصود ہے، اولیا اللہ غیب دان ہوں یا نہ ہوں، علوم غیب اُن پر مکشوف ہو سکیں یا نہ ہو سکیں، کلام اللہ اس کی بحث نہیں کرتا، پھر اس میں شاخیں نکالنے سے کیا حاصل۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ کہو کہ اللہ ہے، پھر ان لوگوں کو چھوڑ دو کہ اپنے غور و خوض میں پڑے کھیلا کریں۔

مراۃ المثنوی

مرتبۂ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ۔

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے۔ کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔

رسائل و مسائل

لونڈیوں سے تمتع

"اکثر علماء لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع کے جواز میں آیت اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ پیش کرتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

ا۔ لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع محض شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے بمصداق مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ۔

ب۔ اگر ملکیت سے مالک کو حق وطی حاصل ہے تو ایک غلام کی مالکہ جو غیر شادی شدہ ہو اس سے کیوں محروم رکھی جائے؟ وہ ضبط نسل کو روکنے کے لیے مانعات حمل استعمال کر سکتی ہے۔

ج۔ غیر مسلم محارب قومیں اگر مسلمات ماخوذہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں تو عقلاً اس کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کا کیا حق ہے؟

د۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے لوث زندگی بالخصوص عالم شباب میں خانگی زندگی کی بہترین مثال ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ آخری عمر میں جب کہ متعدد ازواج مطہرات موجود تھیں آپ نے بھی لونڈیوں سے تمتع کیا؟

ر۔ اگر ملکیت سے حق وطی حاصل ہوتا ہے تو فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ۔ کی صورت میں کیا لونڈی پر دوگونہ حق ہوگا؟ ایک خاوند کو بلحاظ نکاح اور دوسرے مالک کو بلحاظ ملکیت۔ اگر نہیں تو کیوں"

ترجمان القرآن ۔ ملک یمین کی بنا پر تمتع کی اجازت قرآن مجید کی متعدد آیات میں وارد ہوئی ہے۔ سورۂ نساء رکوع اول میں ہے:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔

اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد بیویوں کے درمیان عدل نہ کرسکوگے تو ایک ہی بیوی رکھو یا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہو۔

اسی سورہ کے چوتھے رکوع میں ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور حرام کی گئیں بیاہی ہوی عورتیں مگر وہ جو لڑائی میں تمہارے ہاتھ آئی ہوں۔

سورہ مومنون کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ

اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں یا اپنے ہاتھ کے مال یعنی لونڈیوں کے کہ اس میں ان پر کچھ ملامت نہیں۔

سورہ احزاب کے چھٹے رکوع میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ

اے نبی ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویوں کو حلال کردیا جن کے مہر تم نے ادا کردیے ہیں اور ان لونڈیوں کو بھی جو ان عورتوں میں سے تمہارے قبضہ میں ہیں جنھیں اللہ نے تم کو غنیمت میں عطا فرمایا ہے۔

پھر فرمایا:۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ۔

اب اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں نہ یہ کہ ان کے بدلے میں تم دوسری بیویاں کرو خواہ اُن کا حسن تم کو کتنا ہی پسند آئے، البتہ وہ لونڈیاں حلال ہیں جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔

ان آیات سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ یہ اجازت کن حالات میں دی گئی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس سے استفادہ کی کیا کیا صورتیں شارع نے تجویز کی ہیں۔

جنگ میں گرفتار ہونے والے سبایا کے حق میں اسلام نے جو قوانین وضع کیے تھے ان کو سمجھنے میں آج لوگوں کو اس لیے دقتیں پیش آ رہی ہیں کہ اس زمانے میں وہ حالات باقی نہیں رہے ہیں جن کے لئے یہ قوانین وضع کیے گئے تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیا میں اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھنے اور انھیں خرید و فروخت کرنے کا طریقہ رائج رہا ہے۔ اُس زمانہ میں بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ دو محارب سلطنتیں صلح کے بعد اسیران جنگ کا مبادلہ کرتیں یا ان کو فدیہ دیکر چھڑاتیں۔ زیادہ تر قاعدہ یہی تھا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوتے وہ اسی سلطنت کے قبضہ میں رہتے جس کی فوج ان کو گرفتار کر کے لے جاتی۔ اس طرح آبادیوں کی آبادیاں قید ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلی جاتی تھیں، اور کسی سلطنت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان کثیر التعداد قیدیوں کو مقید رکھ کر ان کے کھانے کپڑے کا بار اٹھاتی۔ اس لیے سلطنتیں اپنی ضرورت کے مطابق قیدیوں کو اپنے قبضہ میں رکھتی تھیں، اور باقیوں کو فوج کے افراد میں تقسیم کر دیتی تھیں، جن کے پاس وہ لونڈی غلام بن کر رہتے تھے۔

یہ حالات تھے جن میں اسلام آیا۔ اس نے آکر پہلی مرتبہ دنیا کو یہ تعلیم دی کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو، یا اسیران جنگ سے مبادلہ کر لو، یا بطریق احسان رہا کر دو۔ لیکن اس اصلاحی تعلیم کا نفاذ تنہا مسلمانوں کے عمل سے نہ ہو سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے غیر مسلم قوموں کا راضی ہونا بھی ضروری تھا اور وہ اُس وقت اس اصلاح کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں، نہ بارہ صدیوں تک آمادہ ہوئیں۔ اس لیے اسلام نے بدرجۂ آخر اس کی اجازت دی کہ اسیران جنگ کو اسی طرح غلام بنا کر رکھا جائے جس طرح دوسری قومیں مسلمانوں کے اسیران جنگ کو رکھتی ہیں۔ مگر اس اجازت سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں ایک پست طبقہ Depressed class کا اضافہ نہ ہو جائے، جیسا کہ ہر اس قوم کے اجتماعی نظام میں ہوا ہے

جس نے دوسری قوموں کو مغلوب کیا ہے قطع نظر اس کے کہ اسیران جنگ کے ساتھ یہ معاملہ خلاف انسانیت تھا، اس سے اُن بہت سے اخلاقی و تمدنی مفاسد کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ تھا جو کسی نظام اجتماعی میں ایک ایسے طبقہ کی پیدائش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ لہٰذا اسلام نے اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھنے کی اجازت دینے کے ساتھ ایسے قوانین بھی وضع کیے جن کا منشا یہ تھا کہ غلامی کی حالت میں جو بہتر سے بہتر سلوک ان کے ساتھ ممکن ہو وہ کیا جائے، اور ایسے اسباب مہیا کیے جائیں جن سے وہ رفتہ رفتہ اسلامی سوسائٹی میں جذب ہو جائیں۔

یہی مقصد ہے جس کے لیے لونڈیوں سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے تصور کو اب سے چند سو برس پیچھے لے جائیے۔ فرض کیجیے کہ ایک غیر قوم سے مسلمانوں کی جنگ ہوتی ہے اس میں ہزاروں عورتیں ان کے ہاتھ آتی ہیں جن میں بہت سی جوان اور خوبصورت بھی ہیں۔ فریق مخالف نہ ان کو فدیہ دیکر چھڑاتا ہے، نہ ان مسلمان عورتوں سے ان کا مبادلہ کرتا ہے جو اس کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ مسلمان ان کو بطریق احسان بھی نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ اس طرح تو ان کی عورتوں کے چھوٹنے کی کوئی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔ ناچار ان کو اپنے ہاں رکھنا پڑتا ہے۔ اب فرمائیے کہ اتنی کثیر تعداد میں جو عورتیں دار الاسلام میں آ گئی ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ ان کو دائم الحبس کر دینا ظلم ہے۔ ان کو ملک میں آزاد چھوڑ دینا گویا فسق و فجور کے جراثیم پھیلا دینا ہے۔ ان کو جہاں بھی رکھا جائے گا ان سے اخلاقی مفاسد پھیلیں گے۔ ایک طرف سوسائٹی خراب ہو گی اور دوسری طرف خود ان کی پیشانیوں پر ہمیشہ کے لیے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔ اسلام اس مسئلہ کو یوں حل کرتا ہے کہ انہیں افراد قوم میں تقسیم کر دیتا ہے، اور ان افراد کو ہدایت کرتا ہے کہ خبردار ان کو رنڈیاں نہ بنا دینا کہ ان سے حرام کراؤ اور ان کو آمدنی کا ذریعہ بناؤ، بلکہ یا تو خود ان کو اپنے تصرف میں لاؤ، یا نہیں تو ان کے نکاح کر دو تاکہ یہ بدکاریاں اور آشنائیاں نہ کرتی پھریں۔ اس قانون کی مختلف دفعات قرآن مجید کے مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔ سورہ نور کے چوتھے رکوع میں ہے:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ اور اپنی لونڈیوں کو جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں زنا کی

اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ زندگی کے عارضی فائدے کی خاطر بدکاری پر مجبور نہ کرو
یہ پہلی دفعہ ہے جس نے لونڈیوں کے ایک برے مصرف کا دروازہ قطعی بند کر دیا۔ مگر یہ ان کے لیے
جو خود اپنی عصمت کی حفاظت کرنا چاہتی ہوں۔ رہیں وہ لونڈیاں جو خود بدکاری کی طرف مائل ہوں، تو
ان کے لیے یہ حکم دیا کہ۔

فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ (٤ : ٤)۔
پھر اگر وہ کوئی بے حیائی کا کام کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو شریف بی بیوں کے لیے رکھی گئی ہے۔

اس طرح ان عورتوں کے لیے بدکاری کا بالکل سد باب کر دیا گیا خواہ مجبورانہ ہو یا رضاکارانہ
مگر نفس تو وہ بھی رکھتی ہیں اور ان کے داعیات فطرت کی تکمیل بھی ضروری ہے، ورنہ ظلم بھی ہوگا۔ اور اخلاقی
مفاسد کے دروازے بھی کھلیں گے۔ اس لیے ان کی نفسانی ضرورتوں کو باعزت طریقہ سے پورا کرنے کی دو
صورتیں تجویز کی گئیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ ان کے آقا ان کے نکاح کر دیں۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (٢٤ : ٤)۔
تم میں جو بیوہ عورتیں ہوں ان کے نکاح کر دو اور تمہارے لونڈی غلام جو نیکوکار ہوں ان کے بھی۔

اسی طرح جو نادار لوگ زیادہ مہر دے کر معزز خاندانوں میں شادیاں کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں
ان کو بھی ترغیب دی گئی کہ تھوڑے مہر پر لونڈیوں سے نکاح کریں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (٤ : ٤)
اور جو شخص تم میں سے اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو وہ تمہاری مومن لونڈیوں سے نکاح کرلے۔

جب یہ صورت ہو تو خود آقا کو ان سے تمتع شہوانی کا حق باقی نہیں رہتا کیوں کہ وہ اپنی مرضی سے

یہ حق دوسرے شخص کو دے چکا ہے اور اب وہ بھی محصنات میں داخل ہو چکی ہیں جن کو نص قرآنی نے شوہر کے سوا سب کے لئے حرام کر دیا ہے۔ آیت مذکورہ کے بعد اس کی تصریح کر دی گئی ہے:۔

فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ (۴)

پس ان کے مالکوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کر دو۔ وہ قید نکاح میں لائی جائیں نہ کہ کھلی اور چھپی بدکاریاں کریں پھر جب وہ نکاح سے پابند ہو جائیں اور اس کے بعد بدکاری کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو شریف بیبیوں کے لئے ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ خود مالک ان سے تمتع کرے۔ اس کی تین شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ محض ملک یمین ہی کو قید نکاح سمجھ کر تمتع کیا جائے۔ دوسری یہ کہ لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا جائے اور اس آزادی ہی کو اس کا مہر قرار دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اس کو آزاد کر کے جدید مہر کے ساتھ نکاح ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اور تیسری صورت کو ترجیح دی ہے۔ اور اس کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں

ایما رجل کانت عندہ ولیدۃ فعلمھا فاحسن تعلیمھا و ادبھا فاحسن تادیبھا ثم اعتقھا و تزوجھا فلہ اجران۔ (کتاب النکاح باب اتخاذ السراری)۔

جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب اچھی تعلیم دے، اور اس کو اچھا ادب سکھائے پھر اس کو آزاد کرے اور اس سے نکاح کر لے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

دوسری حدیث میں ہے کہ اعتقھا ثم اصدقھا۔ یعنی اس کو آزاد کر کے جدید مہر کے ساتھ نکاح کیا ۔۔ ابو داؤد الطیالسی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے۔ جس میں حضور نے فرمایا ہے۔

اذا اعتق الرجل امتہ ثم امھرھا مھراً جدیداً کان لہ اجران۔

جب کسی شخص نے اپنی لونڈی کو آزاد کیا پھر اس کو جدید مہر دے کر اس سے نکاح کیا۔ تو اس کے لیے دو اجر ہو گئے۔

خود آنحضرت ؐ نے حضرت صفیہ اور جویریہ اور ریحانہ کے ساتھ اسی طرح نکاح کیا ہے کہ پہلے ان کو آزاد کیا پھر قید نکاح میں لائے۔ اس باب میں روایات مختلف ہیں آپ نے جدید مہر ادا کیا تھا۔ یا آزادی ہی کو مہر قرار دیا؟ لیکن اغلب یہ ہے کہ آپ نے جواز کی دونوں صورتیں ظاہر کرنے کے لیے دونوں طریقوں پر عمل فرمایا ہے۔ بعض کو جدید مہر دیا ہے اور بعض کی آزادی ہی کو مہر قرار دیا ہے۔[1]

رہی پہلی صورت تو وہ بھی جائز ہے، اس لیے کہ قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کی اجازت عام ہے کسی خاص صورت کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے۔ چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہو چکی ہیں۔ اس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا صرف وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں، دو گواہ ہوں، ایجاب و قبول ہو، خطبۂ نکاح پڑھا جائے۔ اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے۔ لیکن اسلام کوئی رسمی (Conventional) مذہب نہیں بلکہ ایک عقلی (Rational) مذہب ہے وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ نکاح سے ایک عورت ایک مرد کے لئے صرف اس بنا پر حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اس کو حلال کیا ہے۔ اسی طرح اگر ملک یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اس کو حلال کرے تو اس میں کراہت کی کونسی بات ہے۔ نکاح کا مقصد انسان کے جذبۂ شہوت کو ایک حد کے اندر محدود کرنا، اور ایک ضابطہ سے منضبط کرنا، اور مرد و زن کے تعلق کو ایک باقاعدہ تمدنی تعلق کی صورت میں قائم کرنا ہے، اور

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات طیبہ کے آخر زمانہ میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اصل مقصد اسلامی سوسائٹی میں لونڈیوں کے لیے عزت کی جگہ پیدا کرنا تھا، اور آپ خود اپنے عمل سے مسلمانوں کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ انسانی برادری کے اس بدقسمت گروہ کے ساتھ ان کو کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ مگر دشمنان اسلام کی بد طینتی نے پیغمبر اسلام کے اس انتہائی شریفانہ فعل کو بھی نفسانیت پر محمول کر کے چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان عیب چینی پر اتر آئے تو دنیا کا کوئی نیک سے نیک فعل بھی ایسا نہیں جس میں وہ بدی کا پہلو نہ نکال سکتا ہو۔

اعلان کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشہور ہو جائے کہ فلاں عورت فلاں مرد کے لیے مختص ہو چکی ہے، اس کے بطن سے جو اولاد ہو گی وہ فلاں شخص کی ہو گی، اور اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا زوجی تعلق نہ ہو گا۔ یہ سب اغراض ملک یمین سے بھی پوری ہو جاتی ہیں، سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشہور ہوتا ہے کہ فلاں لونڈی فلاں شخص کی مملوکہ ہے۔ کسی دوسرے شخص کے لیے اس لونڈی سے زوجی تعلق پیدا کرنا جائز نہیں ہوتا جب تک کہ مالک اپنی رضامندی سے اس کو نکاح کی اجازت نہ دے۔ لہٰذا لونڈی کا اپنے مالک کے ساتھ اختصاص اس صورت میں بھی قائم ہو جاتا ہے۔ وہ مالک کے تصرف میں آنے کے بعد خاندان کی ایک فرد بن جاتی ہے اس کو ام ولد کہا جاتا ہے۔ اس کی اولاد جائز اولاد سمجھی جاتی ہے، اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ پھر کیا یہ نکاح کی طرح باقاعدہ زوجی تعلق نہیں ہے۔

ہاں اس طریقہ میں ایک کراہت ضرور ہے، مگر وہ ایک دوسرے پہلو سے ہے ملک یمین کی بنا پر جس لونڈی سے نکاح کیے بغیر تمتع کیا جاتا ہے، وہ اصلاً لونڈی ہی رہتی ہے۔ اس کو محصنات کے برابر مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس کی اولاد پر بھی پرستارزادگی کا داغ رہتا ہے۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت اس طریقہ کو دی ہے کہ پہلے اس کو آزاد کر کے شریف عورتوں کے مرتبہ میں لے آؤ، پھر اس سے بطریق معروف نکاح کرو تاکہ اس میں عزت نفس کا وہ احساس پیدا ہو جائے جو شریف عورتوں میں ہوتا ہے، اور وہ مساویانہ حیثیت سے تمہاری سوسائٹی میں داخل ہو جائے، اور اس پر لونڈی پن کا اور اس کی اولاد پر، پرستارزادگی کا داغ نہ رہے۔

اب آپ کے صرف دو سوالوں کا جواب میرے ذمہ باقی ہے۔ ایک یہ کہ اگر مرد کو ملک یمین کی بنا پر تمتع کا حق حاصل ہے تو عورت کو یہ حق حاصل کیوں نہیں ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر غیر مسلم محاربین مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں تو ہم کو اس پر احتجاج کا کیا حق ہے؟ ذیل میں ان دونوں کا جواب علی الترتیب دیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کا حق صرف مردوں کو دیا گیا ہے۔ عورتوں کو نہیں دیا گیا۔
اسی لیے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ
اور دوسری تمام آیات میں خطاب صرف مردوں سے ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زوجی تعلق کے معاملہ
میں عورت اور مرد کے درمیان ہمیشہ سے انسان نے امتیاز کیا ہے، اور یہ امتیاز خود اس کی فطرت میں ودیعت
کیا گیا ہے۔ عورت میں عصمت کا احساس مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ عورت سے باعصمت رہنے کی توقع بھی
مرد کی بہ نسبت زیادہ کی جاتی ہے اور اس کی عصمت کو مرد کی عصمت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اگر
مرد بے حیائی کا فعل کرے تو اس کو اتنی بُری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس سے عورت کو دیکھا جاتا ہے۔ عورت
کی قیمت ازالۂ بکر کے بعد آدھی رہ جاتی ہے۔ مگر مرد دس بیویاں بھی کر چکا ہو تو اس کی قدر و قیمت میں کوئی
فرق نہیں آتا۔ عورت اگر کسی غیر قوم کے مرد کے پاس چلی جاتی ہے تو اس کی ساری قوم اس کو اپنے لیے بے عزتی
سمجھتی ہے لیکن مرد کا غیر قوم کی عورت سے تعلق پیدا کرنا کچھ زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ یہ انسانی فطرت ہے
اور اس کو اسلام نے ایک حد خاص تک ملحوظ رکھا ہے مگر جب یہ چیز جہالت کی حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ اس کو
پامال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ اسلام مردوں کو کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے، مگر عورتوں
کو اہل کتاب سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں تک اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کیا ہے لیکن اگر کوئی
نصرانی یا یہودی مسلمان ہو جائے تو اسلام بلا تامل اس کے ساتھ نکاح کرنے کی ہر مسلمان عورت کو اجازت دیتا
ہے خواہ وہ کیسے ہی شریف گھرانے کی ہو۔ محض نومسلم ہونے کی بنا پر اس سے نکاح کو مکروہ سمجھنا اسلام کی نگاہ میں
خود مکروہ ہے۔ اسی طرح وہ عورت کو اپنے غلام سے تمتع کی اجازت بھی نہیں دیتا، کیونکہ اس سے سوسائٹی میں
اس کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے، اور اگر وہ اس غلام سے قطع تعلق کر کے کسی شخص سے نکاح کرنا چاہے تو
امید نہیں کی جا سکتی کہ کوئی مرد اس کو قبول کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اگر عورت اپنے غلام سے تمتع کرے تو خاندان
میں اس کا مرتبہ گھٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے کہ عورت کو عائلی زندگی میں جو وزن حاصل ہوتا ہے وہ اس کے

شوہر کی بدولت ہوا کرتا ہے۔ اور یہاں شوہر خود غلام ہے جس کو آزاد مرد کا سا مرتبہ حاصل نہیں اس حد تک اسلام نے فطرت انسانی کی رعایت ملحوظ رکھی ہے لیکن اگر کوئی عورت اپنے غلام کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرے تو اسلام اس سے منع بھی نہیں کرتا کیونکہ آزاد ہونے کے بعد اس کو وضیع سمجھنا جہالت ہے۔

دوسری وجہ اور اہم تر وجہ یہ ہے کہ ملک یمین مرد کے لیے تو بمنزلہ نکاح ہو سکتا ہے۔ مگر عورت کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے عائلی زندگی کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ مرد کو عورت پر قوام ہونا چاہیے۔ اسی لیے عورت کا مہر مرد پر واجب کیا گیا ہے، اور عورت پر مرد کو اقتدار کا ایک درجہ دیا گیا ہے تاکہ وہ عورت کی خبر گیری اور حفاظت کرے، اور اپنے گھر میں وہ حاکمانہ قوت استعمال کر سکے جو خانگی زندگی کے نظام کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مصلحت عظمیٰ غلام سے تمتع کرنے کی صورت میں فوت ہو جاتی ہے۔ غلام سے عورت کا تعلق شہوت رانی کی غرض تو پوری کر سکتا ہے، مگر اسلامی نظام تمدن کے ماتحت ان دوسری اغراض کو پورا نہیں کر سکتا، جن کو عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مرد غلام رہنے کی حیثیت سے عورت کا تابع فرمان ہوگا اور اسے گھر میں وہ اقتدار حاصل نہ ہو سکے گا، جو اخلاق و معاملات کی نگرانی اور نظام عائلی کو درست رکھنے کے لیے مرد ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل ہونا چاہیے۔

۲- اگر غیر مسلم محاربین کے پاس ہماری عورتیں گرفتار ہوں گی تو ہم کوشش کریں گے کہ وہ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیں یا اپنی عورتوں کے مبادلہ میں انہیں رہا کر دیں لیکن اگر وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی پر بھی راضی نہ ہوئے تو ہم صبر کریں گے اور ان عورتوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب وہ کفار کے قبضہ میں ہونگی تو ان کے حق میں ہم کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ ان کا معاملہ کفار کے ساتھ ہے، اور وہ اختیار رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں ہمارا قانون صرف انہی عورتوں پر نافذ ہو سکتا ہے جو ہمارے قبضہ میں آگئی ہیں۔ اور یہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ قید کی اس حالت میں اس سے بہتر سلوک کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اسلامی شریعت نے لونڈیوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ کفار کا معاملہ اگر ہماری عورتوں کے ساتھ بہتر سے بہتر بھی ہوا تو اتنا ہی بہتر ہو سکتا ہے جتنا ہم انکی عورتوں کے ساتھ کرینگے، ورنہ بہرحال انکا سلوک اس سے بدتر ہوگا، اور اس پر ہم انہیں ملامت کرنے میں حق بجانب ہوں گے

ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات

"امید واثق ہے کہ ایک محقق اور طالبِ حقیقت کے ذیل کے استفسارات پر ترجمان کے توسط سے روشنی ڈالتے ہوئے نہ صرف مستفسر کو ہی بلکہ تمام ناظرین ترجمان کو بھی تشکر و امتنان کا موقع دیں گے :-

(۱) قرآن نے مسیح کی نسبت چار وعدے ذکر کئے ہیں۔ چوتھا وعدہ ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۔ (۳:۶) مسیح کے متبعین اور مسیح کے کافر دونوں گے وجود کا قیام قیامت تک پایا جانا اس بات کو مستلزم ہے کہ مسیح کے متبعین مسیح کے اتباع پر قائم رہیں اور اتباع کے لیے مسیح کی ہدایت اور تعلیم کا قائم اور محفوظ رکھنا اور پھر قیامت تک محفوظ رہنا ضرور ہے جس سے لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رو سے دائمی ہادی ہے۔ میں اگر یہ سچ ہے تو درمیان میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے وجود کو گھسیڑنے کے کیا معنی۔ دوسرے اسلام کا تخالف پہلی صورت مسلمہ کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اہل اسلام کے نزدیک اگر مسیح آسمان پر زندہ ہیں اور وہی آنے والے ہیں پیغمبر اسلام کے ظہور سے پہلے بھی وہی اور بعد میں بھی وہی، تو اس صورت میں درمیان میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا کیا مطلب! جبکہ غلبۂ متبعین مسیح کا وعدہ استمرار متصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا؟

(۳) آیت اِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۔ (۱۰:۱۰)۔ اس آیت سے جب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اسلام بھی قرآن کی وحی کے متعلق شک میں پڑ جاتے تھے تو اس صورت میں شک کو

نکالنے کے لیے آپ کو حکم ہے کہ اہل کتاب سے آپ اپنا شک نکلوا لیجیے جس سے واضح ہے کہ قرآن پیغمبر اسلام کو بھی شک میں ڈالنے والی چیز ہے اور اہل کتاب کی کتاب اور تعلیم ایسی چیز ہے کہ قرآن کے متعلق شک کرنے والے کو بھی وہی دور کرتی ہے تو اس صورت میں بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے ظہور سے اور مسیح کے بعد آنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور قرآن کریم کی نسبت تو یہ ہے اگر تورات کی نسبت لکھا ہے قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (۳ : ۱۰) جس سے ظاہر ہے کہ توراۃ قابل استشہاد ہے اور وہ اس صورت میں کہ محفوظ ہو اور محرف و مبدل نہ ہو۔ اور یہ صورت بھی پہلی صورت پیش کردہ کی مؤید ثابت ہوتی ہے۔

امید ہے کہ آپ ان ہر سہ سوالات پر جن کا مآل معنی واحد ہے ایمان داری کے ساتھ خوب روشنی ڈالیں گے ورنہ آپ کی خاموشی یا غلط اور ناقابل تسلی جواب سے کئی مسلمان کہلانے والے معزز اور اہل علم محقق عیسائی ہونے والے ہیں۔ اور سات اشخاص تو عیسائی ہو چکے ہیں۔ شاید آپ ابھی تک بے خبر ہی ہوں۔ حیدر آباد میں اندر ہی اندر آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور قدرت شاہ خان مشنری مسیحی کے ٹریکٹ "خط بنام مسلمانان حیدر آباد" نے کیا کچھ تہلکہ مچا دیا ہے کہ کئی خاندانوں کے خاندان عیسائی ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

آپ کا مخلص ایک محقق۔

ترجمان القرآن۔ کاتب خط کوئی مسیحی پادری صاحب معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے مسلمان بن کر سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ ایک سچے عیسائی کی طرح علانیہ سامنے آکر اعتراض کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اور اس صورت میں بھی ان کے اعتراض کا جواب اسی محبت کے ساتھ دیا جاتا جس کے ساتھ ایک بھٹکے ہوئے مسلمان کو دیا جا سکتا ہے۔ خیر طریق اعتراض کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں۔ ہمارا کام بہرحال ان کے اعتراض کو رفع کرنا اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

(۱) آپ نے اپنے پہلے اعتراض میں جو آیت نقل کی ہے اس میں مسیح کا انکار کرنے والوں سے مراد یہودی

ہیں۔ اور مسیح کا اتباع کرنے والوں میں نصاریٰ اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اتباع سے مراد اگر اتباع کامل یعنی ٹھیک قدم بقدم چلنا لیا جائے تب تو نصاریٰ اس کے مصداق نہیں رہتے، بلکہ صرف مسلمان ہی اس کے مصداق قرار پاتے ہیں، اس لیے کہ نصاریٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے اصل الاصول کو چھوڑ دیا، اور یہودیوں کے بالمقابل ایک دوسرے طور پر ان کے ساتھ کفر کیا، بخلاف اس کے مسلمان اسی تعلیم پر قائم رہے جو حضرت عیسیٰ اور تمام دوسرے انبیا علیہم السلام نے دی ہے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی رسول آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں آئے ہوں، ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی، اور وہ یہ تھی کہ خدائے واحد کی پرستش کرو۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ کو خدا مان لو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (۷۹)

کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم خدا پرست بن جاؤ

اسی مقدس گروہ کے ایک فرد حضرت عیسیٰ بھی ہیں اور انہوں نے بھی کبھی عبدیت کے مقام سے بال برابر تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ (۱۷۲)

مسیح نے کبھی اس کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو

پس نصاریٰ کی تثلیث، اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف الوہیت کی نسبت اور ان کو خدا کا بیٹا بنا دینا حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے، اور جو لوگ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی کفر کرتے ہیں، جیسا کہ یہودی کرتے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ... لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے، درآں حالیکہ خود مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے ....

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ : ۱۰) - یقیناً کفر کیا انہوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے

اس لحاظ سے اِتَّبَعُوْكَ کے اصلی مصداق مسلمان اور وہ عیسائی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا رسول مانتے ہیں، ان کی طرف کسی درجہ میں الوہیت کو منسوب نہیں کرتے، اور اس عقیدہ صالحہ کے قائل ہیں کہ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (۴ : ۲۳) اور اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (۴ : ۲۳) - البتہ اگر اتباع سے مراد اتباع کامل نہ لیا جائے، بلکہ فی الجملہ مسیح کو ماننا اور ان کی تعلیم کو کسی نہ کسی حد تک قبول کرنا لیا جائے، تو اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی متبعین مسیح میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اللہ کا یہ وعدہ دونوں سے متعلق ہو جاتا ہے کہ وہ ان کو یہودیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا جنہوں نے مسیح کا قطعی اور کلی انکار کیا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ مسیح کی، اور صرف انہی کی نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیم اپنی اصل کے لحاظ سے قائم و محفوظ ہے، اور قیامت تک رہے گی۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام اس تعلیم و ہدایت کو مٹانے نہیں آئے تھے بلکہ اس کو ثابت اور مستحکم کرنے اور ان آمیزشوں سے پاک کرنے آئے تھے جو انسانی اہواء اور بشری وساوس کی بدولت اس میں گھل مل گئی تھیں۔ نصاریٰ سے ان کی جنگ اس بات پر نہ تھی کہ وہ مسیح اور ان کی تعلیم و ہدایت کو کیوں مانتے ہیں، بلکہ اس بات پر تھی کہ وہ اس کو کیوں نہیں مانتے۔ انہوں نے بار بار اپنے خدا کی طرف سے فرمایا کہ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (۴ : ۲۳) اور يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵ : ۱۰) اور وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۵ : ۹) - اور وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (۵ : ۷) مگر جب دیکھا کہ مسیح کے متبعین سرے سے انجیل ہی کو کھو بیٹھے ہیں اور انجیل کے نام سے مسیح کی چند سوانح عمریاں لیے پھرتے ہیں جن میں مسیح کی تعلیم و ہدایت کا ایک بہت ہی خفیف حصہ اور وہ بھی آمیزشوں سے آلودہ پایا جاتا ہے تو انہوں نے نصاریٰ کے سامنے قرآن

پیش کیا' اور کہا کہ جو کچھ تم نے کھو دیا تھا' وہ پہلے سے بھی زیادہ مکمل صورت میں پھر تمہارے پاس آگیا۔ یہ وہی تعلیم ہے جو مسیح نے دی اور ان سے پہلے موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ دے چکے ہیں۔ تم نے اور تم سے پہلے کی امتوں نے اس ہدایت کو بار بار گم کیا، مگر اب یہ تم کو ایسی مستحکم صورت میں دی جاتی ہے کہ قیامت تک اس کو کوئی گم نہ کر سکے گا۔ پس درحقیقت متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا کی کتابوں میں نہیں بلکہ قرآن میں مسیح کی اصلی تعلیم قائم اور محفوظ ہے اور وہی انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔

آپ کا یہ قول بھی محل نظر ہے کہ آیت زیر بحث سے" لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رو سے دائمی ہادی ہے۔ یہ مفہوم آپ کے تخیل کا پیدا کردہ ہے۔ آیت کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے وہاں تو صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ جو تیرا انکار کرتے ہیں' ان پر ہم تیرا اتباع کرنے والوں کو قیامت تک غالب رکھیں گے۔ ان الفاظ سے یہ معنی کیونکر نکالے جاسکتے ہیں کہ اب تو ہی دائمی ہادی ہے اور تیرے بعد پھر ہدایت پیش کرنے کے لیے کوئی اور نبی نہ بھیجا جائے گا۔ افسوس کہ آیات کتاب میں لفظی و معنوی تحریفات کرنے کی پرانی عادت ہمارے مسیحی بھائیوں میں سے ابھی تک نہیں گئی۔

(۲) مسیح کے بعد پیغمبر اسلام کے ظہور کا مطلب آپ ہم سے پوچھنے کے بجائے خود مسیح علیہ السلام سے پوچھیے جن کا یہ ارشاد تمام تحریفات کے باوجود کتاب یوحنا میں اب تک موجود ہے:۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (تسلی دہندہ یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" (یوحنا ۱۶: ۷-۸)۔

اور یہ کہ:۔

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی

سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا"۔ (یوحنا ۱۵: ۲۶)۔

اور یہ کہ:۔

"لیکن مددگار یعنی سچائی کی روح جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" (یوحنا ۱۴: ۲۶)۔

اور یہ کہ:۔

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" (۱۴: ۳۰)۔

اور یہ کہ:۔

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنے سچائی کا روح آئے گا۔ تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آیندہ کی خبریں دیگا۔ (۱۶: ۱۲: ۱۳)۔

اس سے آپ پیغمبر اسلام کے ظہور کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں "غلبہ متبعین مسیح کا وعدہ" جو استمرار بلافصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا ہے" پیغمبر اسلام کے ظہور سے ٹوٹتا نہیں، بلکہ اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے، کیونکہ پیغمبر اسلام نے آکر مسیح کی گواہی دی (اِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ اور وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ) اور اس بہتان عظیم پر یہودیوں کی توبیخ کی [illegible] اور ان کی ماں پر رکھتے تھے (وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلَى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا) اور [illegible] تین سچوں کو یاد دلائیں جو مسیح نے ان سے کہی تھیں (وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيهِ) [illegible] مسیح اسی لیے گئے تھے کہ اس دوسرے آنے والے کے لیے جگہ خالی کر دیں جو ان کے بعد آکر اس کام کو پورا کرنے والا تھا جسے وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے۔

(۴) آیت اِنْ کُنْتَ فِیْ شَكٍّ الخ میں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے، مگر در اصل تمام لوگ اس کے مخاطب ہیں مقصد اس آیت کا یہ ہے کہ اے مخاطب اگر تجھے قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو جن لوگوں کے پاس قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابیں موجود ہیں ان سے دریافت کرلے۔ ان کی گواہی سے تجھکو معلوم ہوجائے گا کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اشارہ ہے ان پیش گوئیوں کی طرف جو انبیاء سابقین کی کتابوں میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق موجود ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ (۲:۱۴۷)

جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ خود اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے سچی بات کو چھپاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (۶:۱۴)

اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن درحقیقت تیرے پروردگار کی طرف سے اترا ہوا ہے۔

قرآن نے اپنی صداقت پر منجملہ بہت سی شہادتوں کے ایک شہادت انبیاء سابقین کی کتابوں سے بھی پیش کی ہے، اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ بالخصوص ان لوگوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو انبیاء سابقین کی کتابوں کو مانتے ہیں مگر قرآن کی صداقت میں شک کرتے ہیں، اس لیے کہ کتب سابقہ کی گواہی انہی کے لیے معتبر ہو سکتی ہے۔ اس طلب شہادت میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہو کہ قرآن شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ بات کو اس کے صاف اور واضح مفہوم سے پھیر کر پیچیدہ مطالب نکالنے کی کوشش کرنا کسی طالب حق کا کام نہیں، ان طریقوں کو ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو نزاع و جدال کی الجھنوں میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَا اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ سے پہلے ایک اور فقرہ تھا

جس کو آپ نے دانستہ یا نادانستہ چھوڑ دیا۔ پوری آیت یہ ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآئِيلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوهَآ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ۔ (۳:۱۰)

تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے بجز اُن کے جنہیں اسرائیل نے توراۃ کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔ اے محمد کہو کہ توراۃ لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔

اس آیت میں یہود کو یہ الزام دیا گیا ہے کہ تم توراۃ کے احکام کو چھپاتے ہو، اور یہ الزام ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ۔ (۵:۷)۔

وہ تجھ کو اپنے معاملہ میں کیسے حکم بنائیں جب کہ خود ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم ہے اور پھر وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں وہ دراصل توراۃ پر ایمان نہیں رکھتے ہی

قرآن میں یہودیوں کے دو جرم بتائے گئے ہیں۔ ایک جرم یہ ہے کہ وہ کتاب میں تحریف کرتے ہیں دوسرے یہ کہ تحریفات کے باوجود جو کچھ کتاب میں سچی خدائی تعلیم باقی ہے، اس کو بھی اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں چھپاتے، اور اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ یہاں اگر توراۃ سے استشہاد ہے تو وہ یہودیوں کے جرم کتمان پر ہے اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مسائل ایصال ثواب و زیارت قبور وغیرہ

محبوب نگر سے ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

"ایک عرصہ سے دل میں شبہ اور خلش تھی کہ مندرجۂ ذیل مسائل کے متعلق قرآنی رہنمائی پاؤں، مگر کوئی تشفی بخش جوابات نہیں ملے۔ لیکن آپ کی فاضل شخصیت سے امید ہے کہ بذریعۂ احادیث وقرآن کریم اس کے جواز وعدم جواز کے متعلق رہبری فرمائیں گے۔

(۱) ایصال ثواب کے متعلق ہم کو کیا احکام ہیں ؟

(۲) بزرگان دین کے وسیلہ سے دعا مانگنا کس حد تک روا ہے ؟

(۳) بزرگان دین کی قبور کی زیارت کرنا۔

(۴) ہر سال درگاہوں پر عرس اور میلوں کا ہونا۔

قرآن کریم اور احادیث شریفہ کے احکام اس کے متعلق کیا ہیں ؟ میں حنفی مذہب رکھتا ہوں لیکن دل میں شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ براہ کرم بذریعہ رسالہ اس کی اشاعت ہو تو مجھ جیسے دوسرے بھائیوں کے خیالات بھی درست ہو جائیں گے۔"

ترجمان القرآن۔ یہ مسائل جزئیات فقہ سے تعلق رکھتے ہیں، زیادہ مناسب ہوتا کہ ان کے متعلق کسی فقیہہ اور مفتی سے سوال کیا جاتا۔ اس رسالہ کے دائرۂ بحث کو زیادہ تر کلیات اور اصول دین کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، اور مناسب یہی ہے کہ اس کو اسی دائرے میں رہنے دیا جائے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ایصال ثواب اور زیارت قبور اور ایسے ہی دوسرے مسائل کو تنگ نظ

حضرات نے اس قدر اہمیت دے دی ہے کہ اصول دین اور فرائض و ارکان کی اہمیت بھی ان کے مقابلہ میں دب گئی ہے؛ حتیٰ کہ انہی امور پر دل کھول کر انہوں نے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کی ہے۔ درانحالیکہ ان چھوٹے چھوٹے مسائل میں مخالف یا موافق کوئی رائے رکھنے اور اس کو بیان کر دینے سے دین میں بال برابر بھی رخنہ نہیں پڑتا۔ یہ ساری اہمیت جو ان مسائل کو حاصل ہوئی ہے، اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں، بلندی خیال اور وسعت نظر اور اولو العزمی نے ان کے دل و دماغ کو چھوڑ کر دوسروں کے قلوب و اذہان میں آشیانہ بنا لیا ہے۔ اب یہ اس قابل تو رہے نہیں کہ آفاق اور انفس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ اور ان پر غور و فکر کر سکیں، نہ ان میں یہ قابلیت رہی کہ زمین و آسمان کی جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے ان کیلئے مسخر کیا ہے ان سے کام لیں۔ نہ ان میں وہ عظیم الشان خدمات انجام دینے کی صلاحیت باقی رہی جن کے لیے ان کو خیر امۃ اور امۃ وسطا اور شہداء علی الناس کہا گیا تھا۔ نہ ان کے اندر وہ حوصلے اور عزائم ہی باقی رہے ہیں جن کے لیے زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی تھی۔ یہ سب ان کے اسلاف کر چکے، اور ان کے لیے بجز اس کے اور کوئی کام رہا ہی نہیں کہ زیارت قبور اور ایصال ثواب اور عرس و فاتحہ کے مسائل پر غور و فکر اور تحقیق و اجتہاد کی قوتوں کو صرف کریں، اور دین و دنیا کی فلاح کو انہی کے تصفیہ پر منحصر سمجھیں۔ جب تک دنیا اور دین کے بڑے بڑے معاملات اور اہم مسائل مسلمانوں کے پیش نظر رہے، انہوں نے کبھی ایسے حقیر جزئیات کی طرف توجہ ہی نہیں کی؛ بلکہ اس زمانہ میں شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہی نہ ہوا کہ ارواح موتیٰ کو ثواب پہنچایا جائے یا نہیں اور پہنچایا جائے تو کس طرح؟ نہ اس وقت ان کو اتنی فرصت تھی کہ بزرگوں کی وفات کی تاریخیں نوٹ کر کے رکھیں اور ان مقررہ تاریخوں کے آنے سے پہلے شرکت عرس کی تیاریاں کریں اور سب کام چھوڑ کر ٹھیک وقت پر ان کی قبور پر جمع ہو جائیں۔ مگر اب کہ مسلمان سب کرنے کے کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں، جو کچھ غور طلب تھا اس پر غور کر لیا، جو کچھ

جاننے کے قابل تھا اس کو جان لیا۔ اور جو کچھ حاصل کرنے کے لائق تھا اس کو حاصل کر چکے، تو اب اُن کے لیے بجز اس کے اور کیا کام باقی رہا کہ فروع اور فروع کے بھی فروع کی تحقیق میں اپنے اوقات عزیز کو ضایع کریں۔ ان کے لیے اب یہ مسائل اس قدر اہم ہو گئے ہیں کہ انہی پر مذاہب کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ یہی کفر و اسلام کے مدار قرار دیے جاتے ہیں۔ اور کوئی شخص ان پر خواہ موافقت میں اظہار رائے کرے یا مخالفت میں، بہرصورت وہ اس خطرے سے نہیں بچ سکتا کہ کسی نہ کسی مذہب کی طرف سے اس پر کفر و فسق کا فتویٰ لگایا جائے گا۔ اور کسی نہ کسی عالم دین یا شیخ طریقت کی طرف سے اس کو دعوت مناظرہ دی جائے گی جس کا سلسلہ فریقین میں سے کسی ایک کی موت سے پہلے ختم ہونا غیر ممکن ہے۔ ایسی حالت میں ناظرین رسالہ کے حال پر بڑی عنایت فرمائیں گے، اگر اس کو اس خارزار میں نہ گھسیٹیں۔ ہم اپنی ناقص رائے میں جن چیزوں کو دین و ملت کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں اس کو انجام دینے کے لیے بھی ہمیں سکون و اطمینان کے ساتھ کافی وقت میسر نہیں آتا۔ پھر بھلا ان کانٹوں میں الجھنے کے بعد ہم کیا کام کر سکیں گے۔

کوئی شخص یہ شبہ نہ کرے کہ ہم خدا اور رسول کے احکام بیان کرنے میں لوگوں کی شماتت سے ڈرتے ہیں۔ حاشا وکلا۔ دنیا اور اہل دنیا کا خوف کیا چیز ہے کہ کسی مسلمان کو حکم خدا اور رسول کے اعلان و اظہار سے باز رکھ سکے۔ مگر جو چیز ہم کو ان مسائل پر احکام کے اظہار سے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہم کو سرے سے اطاعتِ خدا و رسول، اور احترام شریعتِ خدا وندی ہی کا فقدان نظر آتا ہے۔ ہم یہ امید نہیں رکھتے کہ جب کسی مسئلہ میں قرآن اور سنتِ رسول اللہ کی سند پر کوئی ایسا حکم بیان کیا جائے گا۔ جو لوگوں کی خواہشاتِ نفس اور ان کے مزعومات و مسلمات کے خلاف ہو تو ان کی گردنیں خدا اور رسول کے فرمان کے آگے جھک جائیں گی اور وہ اس فرمان کے مقابلہ میں ہر اس چیز کو چھوڑ دیں گے جو خود ان کو مرغوب ہے۔ یا جس کو رسم و رواج کے طور پر انہوں نے اپنے اسلاف سے لیا ہے۔ پھر جب حال یہ ہے تو جزئی مسائل میں احکام شریعت کو بیان کرنے، اور ان احکام کی مزید بحث و تحقیق کرانے سے کیا فائدہ؟

مثال کے طور اگر ہم یہ کہیں کہ ایصال ثواب کی صحیح صورت قرآن مجید نے یہ بتائی ہے کہ جب والدین یاد آئیں تو ان کے حق میں اللہ سے دعا کرو کہ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ (۱۷:۳)۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے تو آپ پر درود بھیجو يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۳۳:۷)۔ اور صلحاء و اسلاف کو ثواب پہنچانا ہو تو حق تعالیٰ سے عرض کرو کہ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (۱:۵۹)۔ تو کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس طریقے پر عمل کرنا وہ لوگ قبول کریں گے جنہوں نے اپنے اسلاف سے ایصالِ ثواب کا ایک نہایت مفصل اور مرتب ضابطہ پایا ہے اور جن کے نزدیک اس ضابطہ سے یک سرمو تجاوز کرنا بھی دین و دنیا کے خسران کا موجب ہے؟ پھر جب وہ خدا کی دی ہوئی تعلیم پر اپنے ایجاد کیے ہوئے طریقوں اور اپنے آباواجداد کے بنائے ہوئے رسوم و رواجات کو لائق ترجیح سمجھتے ہیں، تو ان کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام پیش کرنا فعل عبث نہیں تو اور کیا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کی تعلیم کو پھیلانا اور احکام الٰہی سے مسلمانوں کو باخبر کرنا اور جاہلی اعمال و عقائد کو مٹا کر مسلمانوں میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنا اس رسالہ کا اولین مقصد ہے لیکن کافی غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر ہم نے ایک ایک جزئی مسئلہ میں لوگوں کے غلط خیالات اور غلط اعمال کی تردید شروع کر دی تو ناگوار بحثیں شروع ہو جائیں گی، بے شمار جھگڑوں میں ہمارا دامن الجھ کر رہ جائے گا۔ اور درحقیقت ہم اپنے مقصد کی راہ میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ اس لیے ہمارے نزدیک اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے زیادہ صحیح اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے لوگوں میں احکام خدا و رسول کی اطاعت، اور شریعت کا احترام پیدا کیا جائے، اور دلائل کی قوت سے یہ حقیقت ان کے ذہن میں بٹھا دی جائے کہ مسلمان کا کام اسلامی شریعت کے سوا کسی قانون

اور کسی رسم و رواج کی پابندی کرنا نہیں ہے ۔ یہ پہلی بنیاد ہے جس کا مستحکم ہونا ضروری ہے ۔ کیونکہ اگر یہی کمزور ہو تو احکام کو ایک مرتبہ نہیں لاکھ مرتبہ بیان کرنے سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہے کہ جاہلیت کے تصورات جو دماغوں پر مسلط ہو گئے ہیں ان کو مٹا کر مسلمانوں میں صحیح اسلامی ذہنیت پیدا کی جائے حتی کہ ان میں یہ استعداد بہم پہنچ جائے کہ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے آئے تو وہ ایک مسلمان کی نظر سے اس کو دیکھیں اور ایک مسلمان کے ذہن سے اس پر غور کریں ۔ یہ چیز اگر حاصل ہو جائے تو بے شمار گمراہیوں کا آپ سے آپ خاتمہ ہو جائے گا ۔ اور کبھی اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی کہ ان کے خلاف فرداً فرداً جنگ کی جائے ۔ اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اسلام کے اصول و کلیات لوگوں کے ذہن نشین کر دیے جائیں ۔ اور اس ضمن میں ان کو بتا دیا جائے کہ اصول و فروع میں کیا فرق ہے ؟ اصول کی اہمیت کیا ہے اور فروع کیا وزن رکھتے ہیں ؟ اصول کس قدر توجہ اور نگہداشت کے طالب ہیں، اور فروع کے ساتھ کہاں تک اہتمام کیا جا سکتا ہے ؟ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ مسلمانوں کے دلوں میں دین کی بنیادیں محکم ہو جائیں گی، بلکہ ضمناً یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ان کے توجہات فروع و جزئیات سے ہٹ کر اصول و کلیات کی طرف مبذول ہو جائیں گی اور ان بہت سی بحثوں کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا ۔ جو فروع کے بیجا اہتمام سے پیدا ہوتی ہیں ۔ علاوہ بریں اصول کو سمجھ لینے سے لوگوں میں یہ صلاحیت بھی پیدا ہو جائے گی کہ بہت سے جزئی مسائل میں وہ خود رائے قائم کر سکیں، اور یہ جان لیں کہ اسلام کو کون سی چیزیں کفر و شرک سے ممتاز کرتی ہیں کون سے اعمال و افکار اگر مشرکانہ نہیں تو شرک کی طرف لے جانے والے ہیں ۔ کون سے اعمال اور رسوم و رواجات اسلام کی اسپرٹ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور کس حد تک ایک مسلمان ان کے ساتھ اہتمام برت سکتا ہے ۔ کونسے طریقے اصول اسلام میں سے کسی اصل کے تحت آتے ہیں، اور کون سے ایسے ہیں جن کی اس دین میں کوئی اصل نہیں ہو سکتی ۔

یہ طریق اصلاح ہے جس کی ہم پیروی کر رہے ہیں۔ قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے اصلاح کا یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تبلیغ دین کا کام اسی ڈھنگ پر کیا ہے۔ لہذا ہمارا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ اگر کچھ کام کرنا ہے، اور فضول معرکہ آرائیوں میں اپنی قوتوں کو ضائع کرنا نہیں ہے تو اسی طریقہ کا اقتدا کرنا چاہیے جس کی طرف اللہ اور اس کے رسول نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ رہے جزئیات فقہ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں شریعت کے احکام معلوم کرنے کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ مگر ہم ان کو مشورہ دیں گے کہ اس کے لیے وہ فقہاء اور اہل افتاء کی طرف رجوع کریں۔

مطبوعات

مصحف ماہوار صحیفہ زیر ادارت جناب شاکر نائطی صاحب وغیرہ۔ چندہ سالانہ تین روپیہ ضخامت ۲۵ صفحات۔ ملنے کا پتہ:- عمر آباد ضلع شمالی ارکاٹ۔

مدراس میں اردو زبان کے ادبی ذوق کو ترقی دینے کی کوششیں ایک زمانہ سے ہو رہی ہیں شفق، سفینہ اور بشریٰ کے نام سے تین رسالے یکے بعد دیگرے اسی غرض کے لیے نکالے جاچکے ہیں مگر اہل ملک کی بے اتفاقی نے ان کوششوں کو ناکام کر دیا۔ اب اسی دور دراز صوبے میں جہاں شائد ہندی کے جاننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، ہندی زبان کو فروغ دینے کے لیے انفاق مال اور گرمی عمل دونوں سے کام لیا جارہا ہے، اور اس رنگ کو دیکھ کر اردو کے حامیوں کی آنکھیں پھر کھلی ہیں۔ "مصحف" کی اشاعت اسی بیداری کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے کہ یہ بیداری پائدار ہو، اور اہل مدراس صرف ایک مصحف ہی کی اشاعت پر قناعت نہ کریں بلکہ اردو زبان کو اپنے صوبے میں پھیلانے کے لیے دوسری مفید تدبیریں بھی عمل میں لائیں ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مصحف میں لکھنے والے زیادہ تر مدراسی حضرات ہیں۔ اور ادبی حیثیت سے ان کی تحریروں کا معیار کسی طرح بھی شمالی ہند کے انشا پردازوں سے فروتر نہیں ہے۔ رسالے کی ترتیب اور مضامین کے انتخاب میں ابھی بہت کچھ ترقی کی ضرورت ہے لیکن فی الجملہ یہ ایک پاکیزہ اور سنجیدہ رسالہ ہے۔

شاہ کار ماہوار مجلہ زیر ادارت جناب مولانا تاجور نجیب آبادی و حضرت راشد ایم اے قیمت سالانہ چھ روپیے دفتر شاہ کار، مزنگ، لاہور۔

ہندوستان کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں اس پرچہ کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے۔ اردو ادب کی قریب قریب جملہ اصناف کے متعلق چیدہ اور مختصر مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں کثرت مضامین اور تنوع کے لحاظ سے

شاید کوئی دوسرا رسالہ اس سے آگے نہیں ہے مگر ابھی معیار زیادہ بلند نہیں، جس سے خود فاضل مدیرین بھی غافل نہیں ہیں کسی زبان کے رسالوں اور اخباروں کی ترقی زیادہ تر اہل زبان کے ذوق مطالعہ پر منحصر ہوتی ہے مگر یہاں یہ حال ہے کہ خود ہندوستان میں انگریزی رسالوں کی تعداد اشاعت پچاس پچاس ہزار تک پہنچ جاتی ہے اور اردو رسالوں کو ہزار دو ہزار سے زیادہ خریدار میسر نہیں آتے ایسی حالت میں اردو صحافت کا معیار بلند ہو تو کیسے ہو؟

شریعت | ہفتہ وار۔ ایڈیٹر محمد حبیب اللہ صاحب بی اے علیگ۔ مقام اشاعت عبداللہ پور ضلع لائل پور (پنجاب)۔ چندہ سالانہ چار روپے۔

حافظ محمد عبداللہ صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی کی نگرانی میں یہ نیا اخبار جاری ہوا ہے۔ اسلامی خیالات کی اشاعت اور مسلمانوں کے مفاد کی حمایت اس کا مقصد ہے، اور خصوصیت کے ساتھ یہ جس چیز کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان رسم و رواج کا قانون چھوڑ کر اسلامی شریعت ہی کو اپنے لیے واحد قانون تسلیم کریں، اور حکومت کو بھی مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے تمام ان معاملات میں جن کا تعلق (Personal) سے ہے، صرف اسلامی شریعت کو اپنی عدالتوں میں نافذ کرے۔ اس غرض کے لیے حافظ محمد عبداللہ صاحب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون بھی پیش کرنے والے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے اس تحریک کی پرزور تائید ہو۔

اخبار مسلمان | زیر ادارت مولوی محمد حنیف صاحب ندوی و عبدالمجید صاحب خادم۔ مقام اشاعت سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ۔ (پنجاب) چندہ سالانہ (عہ)۔

یہ پنجاب کا پرانا اخبار ہے۔ اب اس نے ایک نیا چولا بدلا ہے جو ہر طرح پرانے سے بہتر ہے مضامین زیادہ تر مذہبی رنگ کے ہیں۔ اور عام مذہبی پرچوں کی طرح ان کا رخ جدال و نزاع کی طرف نہیں بلکہ اصلاح اور دعوت الی الخیر کی طرف ہے۔ پنجاب میں خصوصیت کے ساتھ یہ چیز مغتنمات میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینے کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ ملحوظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)